بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قائداعظمؒ اور قرآنِ کریم

قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''

(عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد دکن کے طلباء کو انٹرویو)

قرآنِ کریم کی جامعیت

''اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبنؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''بحراٹلانٹک سے لے کر گنگا تک' ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال واحوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔''

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

> اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت' مذہب' تجارت' عدالت' فوج' دیوانی' فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔۔۔ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔اسی لئے نبی اکرمﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریر۔جلد دوم۔ص۳۰۰)

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خرم علی شفیق

مار ڈالا راویوں نے قوم کو

خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم ہمارے ہاں صدیوں سے مقدس غلافوں میں لپٹی زینتِ طاقِ نسیاں چلی آ رہی تھی اقبال نے اسے ان غلافوں سے نکالا اور اس کے پیغامِ حیات بخش کو اس انداز سے عام کیا کہ اس کے غلغلوں سے فضا گونج اٹھی اور کہا کہ ؎

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اس نے قرآن کے اس پیغام کو عام کیا ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

چونکہ اقبالؒ کا سرچشمۂ فکر قرآن ہے اس لئے ہمارے ہاں کے ''کاہن و پاپا'' اور ''پیرانِ کلیسا'' قرآن کے الفاظ میں احبار و رہبان فکرِ اقبال کو مسخ کرنے کے درپے ہو گئے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے اس شعر کے مصداق ؎

قرآں کے اثر کو روک دینے کے لئے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

اقبالؒ پر پے در پے حملے ہو رہے ہیں۔ تازہ تاخت جامعہ کراچی کے ''جریدہ'' اور ''ساحل'' کے مرتب خالد جامعی کے ''امالی'' کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔ خالد جامعی صاحب کی ہمسائیگی میں ایک صاحب ڈاکٹر غلام محمد رہا کرتے تھے جو بقول ان کے سید سلیمان ندویؒ کے مسترشد تھے۔ سید سلیمان ندویؒ نے اقبال علیہ الرحمہ کے خطبات پر (مبینہ) زبانی تبصرے جو وقتاً فوقتاً کئے وہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھے اور ندوی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی یادداشتیں خالد جامعی صاحب کو املا کرا دیں۔ اب خالد جامعی صاحب کو اصرار ہے کہ پورا عالم آنکھیں بند کر کے یہ تسلیم کر لے کہ یہ تبصرہ اور خیالات واقعتاً سید سلیمان ندوی صاحبؒ ہی کے ہیں (قطعِ نظر راویوں کی ثقاہت یا عدم ثقاہت کے)۔ ایک دفعہ پھر خالد جامعی صاحب کے محبوب شاعر اکبر الہ آبادی یاد آتے ہیں ؎

خوب لڑوایا بہم دِل کھول کر
مار ڈالا راویوں نے قوم کو

ان ''امالی'' کی علمی حیثیت اور مقام کیا ہے اس موضوع پر محترم خرم علی شفیق نے ایک مضمون تحریر کیا ہے جسے ہم اقبال اکیڈیمی لاہور کے شکریہ کے ساتھ قارئینِ طلوعِ اسلام کے ذوق و بصیرت کی نذر کر رہے ہیں۔ **(ادارہ)**

میارا بزم بر ''ساحل'' کہ آنجا!

ڈاکٹر غلام محمد کے امالی میں کچھ ملفوظات سامنے آئے ہے۔ اِن کا تعلق اقبال کے خطبات تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ سے ہے۔ یہ کراچی سے نکلنے والے ہیں جنھیں سید سلیمان ندوی صاحبؒ سے منسوب کیا جا رہا

رسالوں جریدہ اور ساحل کے تازہ شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ ابتدائی تاثرات فوری طور پر تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اِن امالی میں واقعاتی غلطیوں کی بھرمار ہے جن کی نشاندہی ضروری ہے۔

مجھے اِس بات پر حیرت ہے کہ امالی میں اقبال پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ تحریکِ پاکستان اور برِصغیر کی سیاست کو چھوڑ کر زیادہ تر وہی ہیں جو عام طور پر نام نہاد ترقی پسند حلقوں کی طرف سے کیے جاتے رہے ہیں اور جن کا احاطہ مجھے ڈاکٹر مبارک علی کا جواب دیتے ہوئے ایک اور مضمون میں کرنا پڑا تھا۔ امالی کے ملفوظات سید سلیمان ندوی صاحبؒ سے منسوب کیے گئے ہیں (اگرچہ اس دعوے کو قبول کرنے میں مجھے تامل ہے) کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ جرح ونقد اقبال کی سطح پر دو مخالف طبقے کسی نہ کسی طرح ہم خیال ہوگئے ہیں؟

ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی میں سیدھی سادی واقعاتی غلطیاں نہیں ہیں بلکہ حرف سازی اور حکایت بافی کا ایک اُلجھا ہوا جال ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر یہ ماننے کو دل نہیں چاہتا کہ یہ سید سلیمان ندوی صاحبؒ ہی کے ارشادات ہیں۔ جب تک ثبوت نہ مل جائے ہمیں مصلحت پسندی کا یہ چہرہ سلیمان ندویؒ کی تصویر پر چپکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر سلیمان ندوی کے محققین مجھ سے بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہ ملفوظات جس کسی کے بھی ہیں، میں صرف سوانحِ اقبال کے حوالے سے اِن میں در آنے والی غلط بیانیوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔

اِس سلسلے میں ہمیں مندرجہ ذیل نکات کا جائزہ لینا ہوگا:

☆ سید سلیمان ندویؒ کی خاموشی
☆ رجوع کا افسانہ
☆ اقبال کی عربی دانی اور طرزِ تحقیق
☆ اقبال دشمنی
☆ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مودودی
☆ مدیرِ ساحل کے معروضات
☆ اصل سید سلیمان ندویؒ
☆ حاصلِ بحث

سید سلیمان ندویؒ کی خاموشی

خطباتِ اقبال کے بارے میں سید سلیمان ندوی صاحب نے عام طور پر خاموشی اختیار کی مگر مکمل خاموشی نہیں۔ اظہارِ خیال کی ایک مثال ۹ فروری ۱۹۳۸ء کو منائے جانے والے ''یومِ اقبال'' پر اُن کا مقالہ ''ڈاکٹر اقبال کا علمِ کلام'' ہے جس میں مولانا عبدالسلام ندوی کا نام بطور شریک مصنف درج تھا۔ اِس میں تمام حوالے اقبال کی شعری تصانیف سے لیے گئے ہیں اور خطبات کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے حالانکہ مقالے کا موضوع خطبات

سے زیادہ قریب تھا۔

نیم خاموشی کی مثال اقبال کی وفات (اپریل ۱۹۳۸ء) کے موقع پر معارف کا تعزیتی اداریہ تھا۔ اِس میں سید سلیمان ندویؒ نے لکھا:

> اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین۔ بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے۔ وہ نئے فلسفے کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا؛ یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۱۱۹]

اب ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی میں سلیمان ندوی سے منسوب یہ الفاظ پڑھیے:

> یہ دلچسپ بات ہے کہ تمام جدیدیت پسند، کرامت علی سے مشرقی اور اقبال مرحوم تک سب اسلام کی اصلاح کے درپے ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں جو مغرب کی اصلاح چاہتا ہو، تمام عیب نقائص اسلام میں ملتے ہیں، مغرب ہر عیب سے خالی ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے۔ کوئی مغرب کو بدلنا نہیں چاہتا سب اسلام کو بدلنا چاہتے ہیں اور بدلنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۴۹]

دونوں میں سے کون سی بات سچ ہے؟ جو معارف میں شائع ہوئی یا جو امالی میں بیان کی جا رہی ہے؟ جس نے اقبال کے خطبات پڑھ رکھے ہوں اُسے تو ایسی بات کہنا جائز بھی نہیں کیونکہ خطبات میں اقبال نے کہا ہے:

> یورپ کے عینی فلسفہ کو کبھی یہ درجہ حاصل نہیں ہوا کہ زندگی کا کوئی مؤثر جزو بن سکے اور اِس لیے اب حالت یہ ہے کہ یورپ کی فساد زدہ خودی باہم دگر حریف جمہوریتوں کی شکل میں جن کا مقصدِ وحید ہی یہ ہے کہ دولتمندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے اپنے تقاضے پورا کر رہی ہے۔ یقین کیجیے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقا میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں۔ [سید نذیر نیازی (ترجمہ): تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۲۷۶]

ستم ظریفی ہے کہ یہی جملے جب ایک مستشرق کے ہتھے چڑھے تو اُس نے یورپ والوں کو اقبال سے خبردار کرنے کی کوشش کی اور ہم اُس مستشرق کو بھی اقبال کا روحانی شاگرد قرار دیتے رہے ہیں۔ میری مراد آرتھر آربری سے ہے جس نے ۱۹۵۳ء میں رموزِ بیخودی کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے دیباچے میں لکھا کہ اِس نظم کو پیش کرنے سے اُس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ اقبال کے خطرناک ارادوں سے آگاہ ہو سکے۔ خطبات کے اِس اقتباس کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے اُس نے اقبال کو الزام دیا کہ اُنہوں نے یورپ کو یہ سمجھانے کی جسارت کی تھی کہ اُسے مشرق سے تہذیبی اقدار سیکھ کر اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

آربری نے اپنی بات کھل کر کہہ دی لیکن اگر اقبال

کے بارے میں سید سلیمان ندویؒ کے اصل خیالات وہی تھے جن کا اظہار ڈاکٹر غلام محمد کے امالی میں ہو رہا ہے اور اقبال کے بارے میں دوسری تحریریں لکھتے ہوئے اُنہوں نے تقیہ کر لیا تھا تو پھر سمجھنا پڑے گا کہ ہم جن کے وسیلے سے اقبال کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے وہی اقبال کے ساتھ پورا انصاف نہ کر سکے:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

۲

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اقبال کے بارے میں سید سلیمان ندویؒ کے اصل محسوسات یہ تھے تو ہمیشہ اِس کے برعکس کیوں لکھا؟ ایسی باتیں کیوں لکھیں جو امالی کی روشنی میں سرے سے بے بنیاد قرار پاتی ہیں (مثلاً تعزیتی شذرے کا اقتباس)۔ امالی میں اِس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے:

> ہم اقبال مرحوم کی اہمیت وافادیت کو سمجھتے تھے، علماً نے کہا کہ خطبات پر نقد معارف میں آنا چاہیے، اِس ہیچ مداں نے صرف زبانی اتنا کہا کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا، اِس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۴۹]

آگے چل کر کہتے ہیں:

> معارف میں عموماً اِن گمراہیوں پر سکوت کا ایک سبب یہ تھا کہ اقبال مرحوم کی ذات سے اور اُن کے شاعرانہ کمالات سے ملّت کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے اُس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ مولانا ماجد تو اِس معاملہ میں بہت غیرت مند تھے اور چاہتے تھے کہ اقبال مرحوم کے کفر کے خلاف جو کچھ لاوا اُن کے دل میں ہے کتابی صورت میں تحریر کر دیں لیکن اُن کو قائل کرنا پڑا کہ صبر سے کام لیں۔ اقبال مرحوم ملّت کا اثاثہ ہیں۔ اُن کی شاعری نے زخموں کی رفوگری کی لہٰذا ملت سے اُس کا روحانی سہارا چھن نہ پائے بلکہ اُنہیں آمادہ کیا کہ وہ تحریریں بھی شائع نہ کریں جو اقبال مرحوم کے نام جارحانہ لب ولہجے میں لکھی گئی تھیں۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۵۹]

یہاں کچھ ایسا تاثر ملتا ہے گویا معارف کی خاموشی اقبال کے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ شاعرِ مشرق کے مقام پر بھی ٹھہر نہ پاتے۔ حقیقت اِس کے برعکس تھی۔ جب اقبال نے اجتہاد کے موضوع پر پہلی بار لاہور میں ۱۹۲۵ء میں خطبہ دیا تو مسجد وزیر خاں کے خطیب دیدار علی صاحب نے اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ اُس میں اقبال کے خلاف ایسے دلائل پیش کیے جن کے بعد کم سے کم ایک عام مسلمان کی نظر میں اقبال کا ایمان مشکوک ہو جانا چاہیے تھا، مثلاً بانگِ درا میں آفتاب کو پروردگار کہہ کر اُس سے دعا مانگی تھی، وغیرہ۔ نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اقبال کو اپنے دفاع میں کچھ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی، خواص اور عوام نے خطیب

دیدار علی صاحب ہی کو رد کر دیا۔ اگلے برس اقبال الیکشن میں کھڑے ہوئے تو مخالفین نے پراپیگنڈ کیا کہ اقبال رسولؐ اللہ کی معراج کو جسمانی نہیں مانتے اور صرف روحانی معراج کے قائل ہیں۔ اِس دفعہ بھی اقبال اپنے نظریات کی کسی وضاحت کے بغیر ہی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچ گئے (انتخاب جداگانہ بنیادوں پر ہوئے تھے چنانچہ اُنھیں ووٹ دینے والوں میں صرف مسلمان ہی شامل تھے)۔ اِسی طرح کسی سخت مزاج بزرگ کا واقعہ تھا کہ ڈاڑھی منڈھے ہوؤں سے نہ ملتے تھے۔ اقبال اُن کے شہر جا کر اُن کے پاس دعا کروانے پہنچے تو اُنہوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا مگر جب کسی نے بتایا کہ یہی علامہ اقبال تھے تو پیدل دوڑتے ہوئے ٹانگے کے اسٹینڈ پر پہنچے اور خود جا کر اقبال کو روک لیا کہ آپ پر اِن شرائط کا اطلاق نہیں ہوتا۔

چنانچہ اُس ماحول میں اگر سید سلیمان ندوی صاحب اپنے رسالے میں اقبال کے خلاف مضمون چھاپ دیتے یا مولانا ماجد کتاب لکھ دیتے تو کیا اقبال کی مقبولیت میں کوئی فرق آ جاتا؟ ملت سے اُس کا روحانی سہارا اگر چھن جاتا تو یہ سہارا اقبال کی شاعری نہیں بلکہ سلیمان ندوی کا رسالہ اور مولانا ماجد کی کتاب ہوتی۔ علمِ کلام تو عام لوگوں کی دلچسپی کی چیز بھی نہ تھی، تصوف اور پیری مریدی جس میں ہندوستان کے عام اور خاص مسلمان اکثر بندھے ہوئے تھے جب اُس حوالے سے حسن نظامی نے اسرارِ خودی پر معرکہ گرم کیا تو کیا ملت سے اقبال کی شاعری کا سہارا چھن گیا یا جب اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کو اخبار میں بولہبی کا طعنہ دے کر محاذ آرائی کی تو کیا اقبال کی مقبولیت میں کمی آ گئی؟ سلیمان ندوی یا مولانا ماجد کچھ چھاپ بیٹھتے تو صرف اِتنا ہوتا کہ اِن بزرگوں کا موقف سب کے سامنے آ جاتا اور پھر لوگ جو فیصلہ کرتے وہ نہ اِن کے اختیار میں ہوتا نہ اقبال کے بس میں ہوتا۔ اپنی عافیت اندیشی کو امتِ مسلمہ پر احسان قرار دینا اور اقبال کو خواہ مخواہ اپنا احسانمند قرار دینا کچھ ایسی بات ہے جو تاریخی طور پر غلط ثابت ہونے کے بعد بات کہنے والے کے مرتبے کو ہماری نظروں سے گرا دیتی ہے۔

۳

اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جن خطبات کے بارے میں سید سلیمان ندویؒ نے خاموشی اختیار کی اِن امالی میں انہیں سید سلیمان ندویؒ ہی کی زبانی اُمتِ مسلمہ کے لیے کتنا بڑا خطرہ بتایا جا رہا ہے۔ پھر غور کیجیے کہ کیا اِتنے بڑے خطرے پر خاموش رہنا، معارف کے شذرات میں اُس پر اِس طرح پردہ ڈالنا کہ اُسے اسرارِ کلامِ الٰہی اور رموزِ شریعت قرار دینا کیا ایک دیانتدار اہلِ قلم سے متوقع ہو سکتا ہے؟ امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے منسوب ہوا ہے:

> علما نے اُن کی شاعری کے بڑے حصے کو قبول کر لیا کہ یہ ٹھیک تھا۔ جو حصہ غلط تھا وہ غلط ہے۔ لیکن نثر کو قدیم اور جدید

> طبقات نے مسترد کر دیا۔ البتہ مجھے نظر آتا ہے کہ مستقبل میں مغرب فکرِ اقبال مرحوم اور خطبات کو اسلامی معاشروں کو جدید بنانے کے لیے مضبوط آلے کے طور پر استعمال کرے گا۔
> [ساحل: جون ۲۰۰۶ء،ص ۴۹-۵۰]

ساحل کی اس عبارت سے اگرچہ یہ ہرگز واضح نہیں ہوتا کہ یہ تبصرہ سید صاحبؒ کا ہے یا ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ کا؟ یا مرتب کے منہ زور قلم کا شاخسانہ! تاہم فی الوقت فرض کر لیجیے کہ یہ سید صاحبؒ ہی کا ارشاد ہے تو بھی دردمندی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ مزید بیان ہوتا ہے:

> اقبال مرحوم کے خطبات کے مباحث کے نتیجے میں مذہب کا امکان محض فلسفیانہ واہمہ بن جاتا ہے۔۔۔ جس کے نتیجے میں مذہب کالعدم ہو جاتا ہے جیسا کہ مغرب میں ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خطبات کو جب بھی اسلامی معاشروں میں علمی مقام ملا مذہب، اسلامی معاشروں سے رخصت ہو جائے گا۔
> [ساحل: جون ۲۰۰۶ء،ص ۷۳]

یہی نہیں بلکہ یہ بھی:

> مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل میں برعظیم کے مذہبی معاشروں کو تہس نہس کرنے کے لیے خطباتِ اقبال کو ایک طاقت ورقوت کے طور پر کام میں لایا جائے گا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶ء، ص ۷۷]

جس چیز کو اُمّت کے لیے اتنا بڑا خطرہ سمجھتے ہیں اُس پر خاموشی کیسی؟ اِس خاموشی کے لیے جو عذر پیش کیا ہم اُس کا جائزہ پہلے لے چکے ہیں اور پھر صرف خاموشی ہی نہیں نیم رضا بھی ہے جس میں کبھی کبھی اقبال کے فلسفیانہ مقام کی وہ مداحی بھی شامل ہو جاتی ہے جیسی ہم نے معارف کے ایک اقتباس میں سے نقل کی۔ یہ کیسی اُلجھی ہوئی نفسیات ہے؟ کیا ہم تسلیم کر لیں کہ جس سلیمان ندوی کو اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں قلندر کہا تھا اُن کا ذہن واقعی اِس طرح کام کرتا ہوگا؟ ساحل کے سرورق کی طویل تعارفی عبارت میں لکھا ہے:

> اِن امالی کے ذریعے پہلی مرتبہ خطباتِ اقبال کے ضمن میں سید سلیمانؒ کے خدشات، وسوسوں، اندیشوں کا پہلا مفصل جائزہ منظرِ عام پر آتا ہے جو اقبالیات کے ماہرین کے لیے فکر ونظر کے نئے دریچے وا کرتا ہے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶ء، سرورق]

تمام ماہرین کیوں، صرف ڈاکٹر ایوب صابر کافی ہیں! البتہ سید سلیمان ندویؒ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے زیادہ دریچے وا ہوتے ہیں۔ یہ اُن کی ذمہ داری ہے کہ معلوم کریں کہ یہ ملفوظات واقعی سید سلیمان ندویؒ صاحب کے ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو پھر اسلامی علوم و تاریخ کے بیسیوں موضوعات پر باقی تحریروں میں سے کون سی اُن کے اصل خیالات ظاہر کرتی ہیں اور کون کون سی میں کسی مصلحت کے تحت ایسی دوسری چیزوں کی تعریف کی گئی ہے جن کے نتیجے میں اسلامی معاشروں سے مذہب کے رخصت ہو جانے، دین کے کالعدم ہو جانے یا مذہبی معاشروں کے تہس نہس ہونے کا اندیشہ ہے! یہ تحقیق مکمل ہونے تک کیا سید

سلیمان ندویؒ کی تمام تحریروں کو قرنطینہ میں رکھا جائے گا؟

۴

اب امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے منسوب یہ قصہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بارے میں سنیے:

> مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی قاری نے [مولانا ماجد سے] استفسار کیا کہ کیا خطبات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اب کیا ہو گا تو ماجد صاحب نے تیکھے انداز میں صدق میں جواب دیا تھا کہ اقبال مرحوم [اور] سرسید جب کبھی یورپ کے سامنے اسلام پیش کرتے ہیں تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی بات بھی زبان سے ایسی نہ نکل جائے جو یورپ کو ناگوار ہو۔ خطبات اگر ترجمہ ہو گئے تب بھی اِس کے فروغ کا دائرہ بہت محدود رہے گا اور یہ فتنہ کبھی پھیل نہ سکے گا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۵۹]

یہ خوب رہی کہ اسلام کے بارے میں کسی کے خیالات آپ کی سوچ سے ہم آہنگ نہ ہوں تو اُس پر جو دل چاہے الزام لگا دیجیے خواہ الزام درست نہ ہو۔ اقبال نے کون سی تحریر میں یورپ کی ناگواری کا لحاظ کیا تھا؟ میں نے خطبات ہی میں سے وہ اقتباس پیش کیا ہے جو اِس کی تردید کرتا ہے۔ مزید اقتباسات اور تفصیلی بحث اُس مضمون میں پیش کر چکا ہوں جس میں ڈاکٹر مبارک علی کی طرف سے اٹھائے گئے اِسی اعتراض کا جواب دیا تھا۔ کیا غضب ہے کہ اقبال کے خلاف سید سلیمان ندوی، مولانا ماجد اور ڈاکٹر مبارک علی ایک ہی مورچے سے برآمد ہوں!

رجوع کا افسانہ

۱

ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی میں کہا گیا ہے کہ اقبال نے خطبات کے مباحث سے رجوع کر لیا تھا۔ معاف کیجیے گا، یہ سراسر غلط ہے۔ مولانا ماجد کا جو واقعہ اوپر درج ہوا اُس کے بعد سید سلیمان ندویؒ سے یوں منسوب کیا گیا ہے:

> مولانا دریابادی کا یہ اعتماد کتنا درست تھا! خطبات کو میں فتنہ اِس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اقبال مرحوم نے اِن مباحث سے رجوع کر لیا تھا اور نظرِ ثانی کر رہے تھے۔ اُنہیں اِس کا موقع نہ ملا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۵۹]

امالی میں سید سلیمان ندویؒ کی زبان سے اِس دعوے کو کئی دفعہ دہرایا گیا ہے۔ آئیے، ایک ایک کر کے تمام حوالوں کا جائزہ لیتے ہیں:

> آخر عمر میں اقبال مرحوم نے بھی ان نظریات سے رجوع کر لیا تھا۔ ہمارے دوست خواجہ عبدالوحید نے مجھے لاہور کی ایک تقریب کا حال لکھا تھا جہاں اقبال مرحوم نے یہ اعتراف کیا تھا کہ مغربی فکر و فلسفے کو منہاج سمجھ کر اسلام کی توجیہ و تشریح کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے اِس کے برعکس رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ یعنی آخری عمر میں اقبال مرحوم امام غزالی کے منہاج کے قائل ہو گئے تھے... [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۷۳]

اقبال کے اِس اعتراف سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ خطبات کے مباحث سے رجوع کر چکے تھے۔ یورپ کے آخری سفر سے واپسی پر یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور نے انہیں استقبالیہ دیا تھا تو اُنھوں نے کہا تھا:

میں نے اپنی زندگی کے ۳۵ سال اسلام اور موجودہ تہذیب وتمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور وفکر میں بسر کر دیے ہیں اور اِس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصدِ وحید رہا ہے۔ میرے حال کے سفر نے مجھے کسی حد تک اِس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایسے مسئلے کو اِس شکل میں پیش نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اِس کا مطلب بجز اِس کے کچھ نہیں کہ اسلام موجودہ تمدن کے مقابلے میں ایک کمزور طاقت ہے۔ میری رائے میں اِس کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام سے قریب تر لایا جائے۔

اگر یہی وہ تقریب ہے جس کا بیان خواجہ عبدالوحید نے سلیمان ندوی کو لکھ بھیجا تو اِس تقریب کے وقت اقبال انگلستان کے کسی ناشر کے ساتھ خطبات کا نیا اڈیشن ساتویں خطبے کے اضافے کے ساتھ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع کرنے کا بندوبست کر کے آئے ہوئے تھے (امالی میں اِس ساتویں خطبے کو بہت بڑی گمراہی قرار دیا گیا ہے)۔ اِس تقریب کے بعد ہی اُس نئے اڈیشن کے لیے متن پر نظرِ ثانی کی۔ اگر رجوع وغیرہ کیا ہوتا تو اچھا موقع تھا کہ متن میں تبدیلی کرتے۔ انہوں نے لفظی ترامیم کے سوا کوئی تبدیلی نہ کی اور اگلے برس خطبات کا شاندار اڈیشن شائع ہوا۔ کیا غضب ہے کہ وہ ایک اور اڈیشن چھپوانے کی تیاری کر رہے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ دیکھو رجوع کر لیا!

خواجہ عبدالوحید کے بیان کو مزید وسعت دی جاتی ہے اور یہ کسی ایک تقریب تک محدود نہیں رہتا۔ امالی میں ارشاد ہوتا ہے:

آخری زمانے میں اُنھوں نے [اقبال نے] بارہا مختلف مجالس میں اعتراف کیا کہ میں نے مغرب کو منہاج بنا کر اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ یہ طریقہ کار درست نہیں تھا، اسلام کو کسوٹی بنا کر مغرب کو اس معیار پر پرکھنا چاہیے تھا تاکہ اسلام اور مغرب کے مابین مغائرت دُور کی جا سکے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶ء، ص ۹۴]

حضرت، ہمیں تو ایک ہی مجلس کا علم ہے جہاں ایسی بات کہی تھی اور سچ کہیے کہ آپ بھی اُسی ایک کو ہزار کر کے ہمیں دکھا رہے ہیں۔ اوپر خواجہ عبدالوحید کا حوالہ دیتے ہوئے آپ کا انداز بھی کچھ ایسا تھا جیسے ایک ہی تقریب میں اقبال نے یہ بات کہی تھی۔ لیکن اگر کئی تقاریب میں کہی ہو تب بھی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ ایسی بات کا کہنا خطبات سے رجوع کی طرف اشارہ نہ تھا۔ یہاں بھی وہی شک گزرتا ہے کہ یہ سید صاحبؒ کے ارشادات ہیں یا کسی اور کا خامۂ ہذیان رقم!

۲

جملہ معترضہ، اقبال کا یہ کہنا کہ اسلام اور موجودہ تہذیب کی تطبیق جس طرح انھوں نے کی ہے اُس کی بجائے کسی اور طرح ہونی چاہیے تھی، رُوحِ عصر سے اُن کی ہم آہنگی کا مظہر ہے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اقبال نے معذرت خواہانہ سوچ کے زمانے میں آنکھ کھولی تھی اور یہ سوچ اب آہستہ آہستہ ختم ہو کر نئے مکاتب فکر کو جگہ دینے والی تھی جن میں انتہا پسند رجعت نوازی سے لے کر روشن خیال روایت پسندی تک کئی دھارے گِنوائے جا سکتے ہیں۔ ہماری نسل اِنہی مکاتب فکر کے زمانے میں پروان چڑھی ہے اور جو بات اقبال کے خطبات میں ہمارے لیے سب سے زیادہ الجھن پیدا کرتی ہے وہ کہیں کہیں اُن کا معذرت خواہانہ انداز ہے۔ ایسے میں جب اُن کا اِس قسم کا بیان سامنے آتا ہے تو وہ اچانک ہمیں ہمارے دَور کے باشندے دکھائی دینے لگتے ہیں اور اُن کی فکر (جس میں اُن کے خطبات شامل ہیں) اپنے زمانے کی پابند ہونے کے باوجود ہمارے زمانے میں جھانکتی محسوس ہوتی ہے۔

میں خود بھی جب اقبال کی سوانح پر کام کرتے ہوئے اُن کے اِس بیان پر پہنچا تو مجھے خیال ہوا کہ اِس کے بعد اُن کی سوچ کا رُخ بدلا ہو گا اور شائد اُن کی زندگی کے باقی برسوں میں ایسی تحریریں مل جائیں جنھیں ہم اُس زمانے کے مخصوص رجحانات سے الگ کر کے ان مصنفین کے سامنے پیش کر سکیں جنھیں اقبال کے اس رویے سے کچھ شکایت ہے۔ جہاں تک علمِ کلام سے متعلق اقبال کے خیالات کا تعلق ہے مجھے اپنی تلاش میں ناکامی ہوئی اور کسی بنیادی تبدیلی کا سراغ نہ ملا۔ البتہ عالمی نظام سے متعلق ایک رویہ اِس مرحلے کے بعد اُن کے یہاں دن بدن زور پکڑتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہی خیال ہے جسے ۱۹۲۰ء میں انہوں نے یونیورسل سوشل ری کنسٹرکشن یعنی عالمی سماجی تشکیلِ جدید کا نام دیا تھا مگر جس کا اظہار یورپ سے آخری سفر کے بعد بہت خوبصورت انداز میں ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو ایک خط میں کیا۔ حسنِ اتفاق، یہ خط سید سلیمان ندویؒ صاحب کے نام تھا:

مخدومی، السلام علیکم

> دنیا اِس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اُس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالتِ نزع میں ہے۔ غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اِس جدید تشکیل کا کہاں تک مد ہو سکتا ہے؟ اِس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمایئے، اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اِس ضمن میں مفید ہو تو اُن کے ناموں سے آگاہ فرمایئے۔ والسلام، محمد اقبال۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی

نظر میں، ص۲۱۵]

۳

امالی میں معرکے کی چیز وہ قصہ ہے کہ مولانا ماجد نے اقبال کے خطبات پڑھ کر سخت تنقیدی خط لکھا جس کی وجہ سے اقبال ڈر گئے اور...اُس کے بعد اقبال نے کیا کیا؟ افسوس، امالی کے بزرگ کبھی کہتے ہیں اقبال نے خطبات کی ساری زبان بدل کر کتاب شائع کروائی، کبھی کہتے ہیں خطبات کا ارادہ ہی ترک کر دیا، کبھی کہتے ہیں خطبات پر نئے سرے سے نظرِ ثانی شروع کی جو کبھی شائع نہ ہوسکی۔ گویا خود بھی اندازہ نہیں کہ اِن میں سے صرف کوئی ایک بات درست ہوسکتی ہے۔ بھلا یہ تمام باتیں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ اگر ایک بات درست ہے تو باقی آپ نے جھوٹ کیوں کہیں؟

آیئے ان تمام بیانات کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ کس طرح یہ تاریخی واقعات کی روشنی میں بلکہ ایک دوسرے کے تقابل میں بھی غلط ہیں۔

> میرے مشورے سے اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کو خطبۂ اجتہاد اور دیگر خطبات ارسال کیے تھے۔ ماجد صاحب نے نہایت سخت رائے دی۔ اُنہوں نے اقبال مرحوم کو یہ بھی لکھا کہ علومِ اسلامی پر عبور کے بغیر اسلام پر نقد بہت بڑی جسارت ہے۔ آپ عربی زبان سے کما حقہ واقف نہیں اور صرف ترجموں سے مدد لے کر یا اہلِ علم کی معاونت سے اسلام کے

مسلمات، قرآن وسنت اور تعاملِ امت سے ثابت شدہ امور، حتیٰ کہ عقائد جنت دوزخ کے بارے میں بھی آپ آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں۔ قرآن وسنت کو منہاج نہیں بناتے، یہاں تک تو معاملہ ٹھیک ہے کہ آپ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہیں لیکن اِس تلاش کے دوران تشکک اور ریب کی اِس کیفیت میں آپ کی جانب سے اِن مہماتِ مسائل میں اِس رائے کا تحریری اظہار سیدھے سادھے لفظوں میں کفر ہے۔ یہ ماجد صاحب کا انداز تھا، دین کے معاملے میں وہ مداہنت برداشت نہ کرتے تھے۔ اُن کے خط سے اقبال کو شدید ذہنی دھچکا پہنچا۔ اُنھوں نے [مولانا ماجد نے] مشورہ دیا تھا کہ آپ کی علمی اُلجھنیں بجا ہیں لیکن آپ اُلجھن سوال کی صورت میں جید علما کے سامنے پیش کیجیے پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو توقف کیجیے۔ اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ آپ دین میں تضاد تلاش کر رہے ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت نہیں۔ آپ کو اللہ نے دوسری صلاحیتیں دی ہیں۔ اُس سے کام لیجیے، فقہ اور اجتہاد آپ کے دائرۂ علم سے باہر کی چیزیں ہیں۔ ان امور پر صرف وہ شخص کام کرے جس نے اپنی عمر ان معاملات کی تہ تک پہنچنے میں بسر کر دی ہو اور صدرِ اول سے لے کر آج تک کے تمام فقہی ذخیرے، اختلافاتِ ائمہ، اختلافاتِ مجتہدین، پوری اسلامی تاریخ اُس کے مختلف ادوار وغیرہ پر اُس کی فقیہانہ نظر ہو۔ جس طرح آپ نے مغرب میں جا کر مغربی فکر و فلسفے کی تعلیم حاصل کی بالکل اُسی طرح آپ کی یہ اولین ذمہ داری ہے بلکہ ذمہ داری نہیں آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ علومِ اسلامی کی تحصیل بالکل اُس طرح اِس کے مراکز

میں جا کر کریں۔ جب مغربی فلسفے کے لیے مغرب اور جرمنی جا سکتے ہیں تو اسلامی علوم کے لیے اس کے مراکز و مصادر سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۸۳-۸۲]

اقبال نے یورپ جا کر مغربی فلسفے کی تعلیم کہاں حاصل کی؟ اِسے تو لاہور ہی میں مکمل کر چکے تھے۔ جرمنی سے وہ عربی میں ڈگری لائے تھے مگر امالی کے مطابق مولانا ماجد نے فرض کر لیا کہ اقبال کو عربی نہیں آتی ہوگی اور مغربی فلسفہ پڑھنے یورپ گئے ہوں گے (اقبال کی عربی دانی پر ہم آگے چل کر بات کریں گے)۔ مولانا ماجد نے یہ خط کس زمانے میں لکھا؟ امالی میں سنہ نہیں بتایا گیا مگر جو تفصیل دی ہے اُس سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی جاسکتی ہے:

اُن کی [اقبال کی] تحریر نہایت گنجلک ہے اور میرے خیال میں اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کی شدید تنقید کے بعد احتیاط کے طور پر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ طرز ایجاد کیا تھا تاکہ بات کہ دی جائے اور گرفت بھی نہ ہو۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۹۲]

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ تنقید کتاب کے پہلے اڈیشن کی اشاعت سے پہلے ہوئی کیونکہ طرزِ تحریر تو ۱۹۳۰ء کے پہلے اڈیشن میں متعین ہو گیا تھا۔ دوسرے اڈیشن میں جو ۱۹۳۴ء میں آیا، طرزِ تحریر بدلا نہیں گیا۔ مگر پھر امالی کچھ اور بھی کہتے ہیں:

اجتہاد پر اقبال مرحوم کا خطبہ جو شائع ہو چکا ہے۔ پہلے متن سے بہت مختلف ہے۔ اِس میں بھی انحرافات کے بہت پہلو ہیں لیکن پہلا متن تو بے حد غلط سلط تھا۔ علماؑ کی تنقید سے اقبال مرحوم نے یہ بات سمجھ لی۔ دینی مسائل میں اُن کی دخل اندازی اُن کے بس کی بات نہیں، لہٰذا وہ شاعری کریں اور ان امور تک محدود رہیں جن پر انھیں عبور حاصل ہو ورنہ دین چیستاں بن جائے گا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۸۷]

یہ بیان اشکال سے خالی نہیں ہے اور حقائق کو توڑ مروڑ کر خلطِ مبحث کی کوشش کا نمونہ ہے۔ اجتہاد پر اقبال کے خطبے کے پہلے متن سے مراد اگر وہ خطبہ ہے جو اقبال نے ۱۹۲۵ء میں لاہور میں دیا تو علما کی تنقید اُس زمانے سے لے کر ۱۹۳۰ء میں خطبے کی اشاعت کے درمیانی عرصے میں ہوئی ہوگی۔ اگر اُس خطبے کو اولین شکل سمجھ رہے تھے جو اقبال نے ۱۹۲۹ء میں دیا تو پھر تنقید کا عرصہ ذرا تنگ ہو کر ایک ڈیڑھ سال رہ جاتا ہے۔ بہرحال خطبۂ اجتہاد پہلی بار ۱۹۳۰ء میں پوری کتاب کے ساتھ ہی شائع ہوا۔ امالی کے بزرگ کہتے ہیں کہ اِسی دوران اقبال سمجھ چکے تھے کہ اُنہیں صرف شاعری کرنی چاہیے اور دینی مسائل میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ یہ بات کس طرح مانی جاسکتی ہے جبکہ اُنہوں نے دو سال بعد ایک اور خطبہ دیا، آیندہ بھی اِس موضوع پر قلم اٹھاتے رہے اور چار سال بعد خطبات کا بین الاقوامی اڈیشن بھی شائع کیا۔ یہ بات امرِ واقعہ نہیں بلکہ کوئی ایسی خواہش لگتی ہے جس کی شدت کی وجہ سے خواہش کرنے والا آہستہ آہستہ سمجھنے لگے کہ واقعی ایسا ہو گیا تھا۔

امالی میں جو بزرگ بول رہے ہیں وہ مزید فرماتے ہیں:

ماجد صاحب کی تنقید کے بعد اقبال مرحوم نے خطبات کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۸۶]

سبحان اللہ! پھر خطبات چھپے کیسے؟ مگر آپ کا دل نہیں بھرتا اور آپ اِسی فینٹسی کو ابھی ایک اور طریقے سے سوچ کر حظّ اٹھاتے ہیں:

ماجد صاحب کے خط نے اقبال مرحوم کی ہمت شکستہ کر دی تھی۔ انہوں نے اِس تنقید کی روشنی میں خطبہ میں بہت سی ترامیم کیں، تغیرات کیے، نظرِ ثانی کا یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلا، لیکن ماجد صاحب کی خواہش کے باوجود اقبال مرحوم نے انھیں نظرِ ثانی شدہ مسودہ ارسال نہیں کیا۔ انھیں خدشہ تھا کہ ماجد صاحب اِس سے بھی مطمئن نہ ہوں گے۔ مجھے یہ مسودہ ارسال کیا گیا تھا۔ اِس پر میرے کچھ تحفظات تھے اور تنقید بھی، اقبال مرحوم کو قلق تھا کہ علما نے ان کے خطبات کا خیر مقدم نہیں کیا۔ وہ علما کی طاقت سے بخوبی واقف تھے اور تنِ تنہا اُن سے مقابلہ کرنے کی سکت نہ پاتے تھے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۸۷]

بیان کے پہلے حصے سے تاثر ملتا ہے کہ یہ اقبال کی زندگی کے آخری دَور کی بات ہوگی۔ اِس لحاظ سے پچھلے بیان کی نفی ہوتی ہے کہ اقبال نے مولانا ماجد کی تنقید سے گھبرا کر وہ اندازِ تحریر اختیار کیا جو خطبات کے مطبوعہ نسخوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر مان لیں کہ امالی کے بزرگ نے وہاں غلط بیانی کی تھی اور یہاں سچ بولا تب بھی کہتے ہیں کہ اقبال علما کی طاقت کا تنہا مقابلہ کرنے کی سکت نہ پاتے تھے۔ یہ بات تو آخری زمانے میں نہیں تھی۔ آخر حسین احمد مدنی کا مقابلہ تنہا کیا تھا۔ پھر مولانا ماجد کا اعتراض خطبات کے کسی ایک آدھ مباحث تک نہ تھا بلکہ سرے سے یہی بات گوارا نہ تھی کہ اقبال دینی مسائل پر قلم اٹھائیں۔ اگر اقبال اُن کی بات مانتے تو پھر دینی مسائل پر اظہارِ خیال سے مکمل گریز کر کے صرف شاعری کرتے مگر ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا!

۴

اقبال نے شبلی کی الکلام میں سے شاہ ولی اللہ کی عبارت پر ایک تبصرے کو اپنے خطبۂ اجتہاد میں شامل کیا تھا۔ انھیں خود ہی اندازہ ہوا کہ اِس معاملے میں شبلی کی تحریر شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت سے مختلف ہے تو سید سلیمان ندویؒ سے بھی مشورہ کیا۔ اِس کی کچھ تفصیل آگے ''اقبال کا طرزِ تحقیق'' کے تحت پیش کی جائے گی مگر یہاں رجوع کی ایک اور فینٹسی سنیے:

شاہ ولی اللہ کے نام سے غلط حوالہ پیش کرنا ایک ایسے خطبے میں جسے علماً کی نظر سے گزرنا تھا بڑی جرات کی بات تھی۔ ماجد صاحب نے اِس غلطی کو بھی واضح کیا تھا لیکن مرحوم پر یہ غلطی اُس وقت واضح نہ ہوسکی۔ جب اقبال مرحوم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اُن سے بہت بڑی غلطی ہوئی اور اُمت کے اجماع کے برعکس رائے دی گئی ہے اور دلیل بھی محرف ہے تو وہ دل

گرفتہ ہوئے۔ مجھ سے خط و کتابت کے ذریعے استفسار کیا۔ دوسرے علماٗ سے بھی رجوع کیا۔ خطبات پر نظرِ ثانی کا وعدہ کر لیا لیکن مہلت نہ ملی۔ اقبال مرحوم کے مسودات میں نظرِ ثانی شدہ عبارتیں مل سکتی ہیں۔[ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۹۴]

اقبال نے پہلی بار اِس حوالے کا ذکر سید سلیمان ندوی صاحبؒ سے ۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء کے ایک خط میں کیا۔ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے پہلے اُن کے درمیان اِس کا ذکر نہیں آیا تھا:

الکلام (یعنی علمِ کلامِ جدید) کے صفحات ۱۱۳-۱۱۴ پر مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے جس کے مفہوم کا خلاصہ انہوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے...[اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۱۹۹]

پانچ دن بعد ایک اور خط لکھا کہ شاہ ولی اللہ کی کتاب بھی نظر سے گزر گئی ہے۔ اِس کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۳۴ء تک کسی خط میں اِس مسئلے پر گفتگو نہیں۔ اُس روز سید سلیمان ندوی صاحب کے ایک پرانے خط کا ذکر کر کے کسی کتاب کا حوالہ طلب کیا۔ اس تحریر میں کہیں بھی اُس دل گرفتگی کا اظہار نہیں جس کا ذکر امالی میں کیا جا رہا ہے۔ جواب ملنے پر یکم فروری ۱۹۳۴ء کو اگلے خط میں لکھا:

آپ نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے، مگر میں اُن معاملات کی ایک فہرست چاہتا ہوں جن کے متعلق رائے قائم کرنا 'امام' کے سپرد ہے...[اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۲۱۷]

اِس متن میں یا اِس کے لب و لہجے میں بھی کسی دل گرفتگی کا شائبہ نہیں۔ ڈیڑھ سال بعد ۷ اگست ۱۹۳۶ء کو اُنہیں لکھا:

ان شاء اللہ موسمِ سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اُس میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے۔ بدور البازغہ بھی اِسی مقصد کے لیے منگوائی ہے۔ اِس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہو گی کہ اِس وقت اِسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۲۲۹]

لیجیے، پہلے اجتہاد پر خطبہ دیا تھا اب پوری کتاب لکھنے کا ارادہ ہے اور یہ وفات سے صرف بیس مہینے قبل کی بات ہے۔ اِس کے بعد سید سلیمان ندوی صاحب کے نام صرف ایک اور خط ۱۹ مئی ۱۹۳۷ء کا دستیاب ہے مگر اُس میں بھی فقہ کی کچھ کتابوں کا پوچھا ہے کہ کہاں سے دستیاب ہوں گی۔ اگر فقہ اور اسلامی علوم پر قلم اٹھانے سے تائب ہوئے تو کب ہوئے؟ وہ نظرِ ثانی کا وعدہ کب کیا؟ خطبات کے مباحث سے اقبال کا رجوع ایک ایسی فینٹسی ہے جسے امالی میں جب بھی دہرایا گیا کوئی نیا گل کھلا مگر یہ گل، گل بکاولی ہی رہا کہ

داستان سے باہر اِس کا سراغ نہیں ملتا۔

۵

امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے یہ افسوس منسوب ہوا ہے کہ مولانا ماجد اور دوسرے علما نے اقبال کو اُن کے خطبۂ اجتہاد پر جو تنقیدی خطوط لکھے اُنہیں اقبال نے شائع نہیں کروایا اور اُن کے بعد اُن کے ورثاؔ نے بھی ان کی اشاعت کا اہتمام نہیں کیا۔

علما نے تو اپنی تحریریں معارف میں بھی بھجوائی تھیں، آپ نے کیوں نہ شائع کر دیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ امالی میں جو بزرگ بول رہے ہیں اُن کا شیوہ ہی کچھ اور ہے۔ چاہتے ہیں کہ بندوق چلے تو اقبال ہی کے کندھے پر رکھی ہو یا اُن کے ورثاؔ یہ بوجھ اُٹھائیں۔ خطبات پر اعتراضات کا اظہار نہ کرنے کے لیے جس طرح کی تاویلیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں وہ بری طرح کھٹکتی ہیں۔ اقبال سے تو کبھی یہ توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کسی مسئلے پر اظہارِ خیال نہ کریں، بظاہر مصلحت آمیز تعریفیں کرتے رہیں، اندر ہی اندر کُڑھتے رہیں اور پھر اپنی مجبوری کو کسی مصلحت کا رنگ دے کر سرخرو ہونے کی کوشش کریں۔ اُس زمانے میں اور آج بھی اقبال اپنے چاہنے والوں میں اِس وجہ سے بھی مقبول ہیں کہ ہم ہمیشہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ انھوں نے جو سوچا ہوگا وہی کہا بھی ہوگا۔ اِس کے برعکس اِن امالی میں جس قسم کی ذہنیت سامنے آتی ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ کس طرح پیچ در پیچ حکایت سازی اور مصلحت کا جال ہے۔ اِسے سید سلیمان ندویؒ سے منسوب کرنے میں ابھی مجھے تامل ہے مگر یہ ملفوظات جس کسی کے بھی ہوں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک اُلجھے ہوئے ذہن کو ظاہر کرتے ہیں۔ اِن کا مطالعہ بجائے خود اُس ذہنیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے جس کے خلاف اقبال برسرِ پیکار رہے۔

اقبال کی عربی دانی اور طرزِ تحقیق

۱

ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے ایک اور بات منسوب کی گئی ہے جو عام طور پر لوگوں میں مشہور تھی اِس لیے امالی والے بزرگ بھی اِسے لے اُڑے ورنہ اِس کی حقیقت کچھ اور ہے:

> اقبال مرحوم نے بتایا تھا کہ وہ بعض مقامی علما سے عربی کتب کا متن پڑھوا کر سنتے ہیں۔ پھر وہ علما ان عبارتوں کا ترجمہ وتشریح کر دیتے ہیں، پھر اقبال مرحوم اُن کی سماعت کے بعد سوالات در سوالات کے ذریعے اُن مباحث ومسائل کو سمجھنے کی سعی فرماتے ہیں، لیکن ان علماؔ کا مغربی فلسفے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ اقبال مرحوم کے فلسفیانہ سوالات کے تسلی بخش جوابات دینے کی اہلیت بھی نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ فلسفیانہ مباحث سے واقف نہ تھے... ماجد صاحب کی تنقید کے بعد اقبال مرحوم نے خطبات کا ارادہ ترک دیا تھا۔ انہیں احساس

ہو گیا کہ یہ مباحث اِس قدر سادہ نہیں کہ انہیں امہات کتب کے تراجم کی ساعت کے ذریعے طے کر دیا جائے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۸۶]

اب اقبال کا اپنا بیان پڑھیے جو اُنہوں نے مہاراجا کشن پرشاد کے نام ۱۵اپریل ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں اپنی عربی دانی کے بارے میں لکھا تھا:

اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش گزار کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اول رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ امسال الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ [سید مظفر حسین برنی، مرتب: کلیات مکاتیبِ اقبال، (جلد اوّل) ص ۵۹۰-۵۸۹]

اِس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کی پہلی ملازمت بھی اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر ہی کے طور پر ہی شروع ہوئی تھی۔ فرض منصبی کے طور پر وہ پڑھاتے تھے اور اس کے ساتھ مابعد الطبیعات پر الجیلی کی کتاب کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ یورپ میں تحقیق کا موضوع بھی ایرانی مابعد الطبیعات تھا جس کا غالب حصہ اسلامی علوم ہی پر مشتمل تھا۔ کیمبرج اور جرمنی کے کتب خانوں میں بھی اسلامی علوم کے نادر مخطوطے کھنگالتے رہے اور میونخ یونیورسٹی نے بھی فلسفے کے شعبے میں نہیں بلکہ عربی کے کھاتے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ امالی کے بزرگ کی کتنی بڑی زیادتی ہے کہ وہ ایسا تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں گویا اقبال کو عربی آتی ہی نہیں تھی اور وہ کوئی بھی عربی کتاب پڑھنے کے لیے دوسروں کے محتاج تھے۔

۲

اقبال کے طرزِ تحقیق کے بارے میں بھی امالی میں کچھ غلط بیانیاں ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں اقبال نے کولمبیا یونیورسٹی سے شائع ہونے والی ایک کتاب کا مطالعہ کیا تھا جس کے مصنف کا نام اغنی دیس تھا۔ اس کتاب میں نصوصِ قرآنی سے متعلق ایک ایسی بحث تھی جس پر غور و خوض کرنے سے خطبات کا آغاز ہوا۔ اقبال نے جن لوگوں سے مشورہ کیا اُن میں سید سلیمان ندوی صاحب بھی تھے۔ بس اِسی بات پر امالی کے بزرگ پھیل جاتے ہیں:

اغنی دیس کے استدلال کی بنیاد علامہ آمدی، قاضی شوکانی اور عبدالعزیز بخاری کے دلائل پر رکھی گئی تھی اور اقبال مرحوم ان تینوں کتابوں سے واقف نہ تھے... اجماع کی نصِ قرآنی سے منسوخی کے سوال پر میں نے مختصر جواب تحریر کر دیا تھا کہ شاید وہ فکر کی درا کی کے ساتھ فقہ اسلامی کے لٹریچر کی غواصی بھی فرمائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۹۳]

یہ درست نہیں ہے۔ اقبال نے اغنی دیس کی کتاب

کے حوالے سے سلیمان ندوی کو ۱۸ اگست ۱۹۲۴ء کو خط لکھ کر سوال پوچھا مگر اگلے روز یعنی جواب ملنے سے پہلے ہی ایک اور خط لکھا:

> تخصیص و تعمیمِ احکام کا جہاں تک تعلق ہے، اس خط کے جواب کی زحمت گوارا نہ فرمایئے کیونکہ قاضی شوکانی کی ارشاد الفحول سے اس کا حال مجھے معلوم ہوگیا ہے۔ علامہ آمدی کی کتاب، جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہاں نہیں ہے۔ ان شاء اللہ سرما میں یونیورسٹی کے لیے ایک کاپی منگوانے کی کوشش کروں گا... [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۱۷۷]

۳

غلط بیانی کی حد ہوتی ہے مگر بیمار ذہن کی گراوٹ کی کوئی انتہا نہیں۔ امالی کے بزرگ فرماتے ہیں:

> ان کا طریق کار یہی تھا کہ وہ مستشرقین، منکرینِ حدیث، ملحدین، مغربی فلاسفہ کی کتابوں میں پڑھ کر اسلام پر وارد اعتراضات جمع کرتے ان کی علمی تنقیح کے بجائے مختلف علماً کے سامنے اشکالات پیش کر کے ان علماً کے جوابات سے اطمینانِ قلب حاصل کرتے یعنی اقبال مرحوم اپنے اشکالات کے ضمن میں صرف اور صرف تقلیدِ علماً پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہاں اُن کی اجتہادی قوت کام نہیں کرتی تھی۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۹۳]

شبلی نے الکلام میں شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کی ایک عبارت نقل کرتے ہوئے کانٹ چھانٹ کر دی تھی۔ اردو میں اُس کا خلاصہ دیتے ہوئے ایسا مفہوم لکھ دیا جو شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت سے نکلنا محال تھا۔ اقبال نے خطبۂ اجتہاد میں شاہ ولی اللہ کے حوالے سے یہی بات درج کر دی مگر شبلی کا موقف اختیار کیا۔ امالی کے بزرگ اِس بات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اقبال کو شاہ ولی اللہ کی اصل کتاب پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> اقبال مرحوم اپنے علمی دعوؤں کی دلیلیں دوسروں سے حاصل کر کے اپنے نام سے پیش کرتے تھے۔ خطبات میں ایک اور مقام پر بھی اقبال مرحوم نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے استاد مرحوم مولانا شبلی کی کتاب الکلام سے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ اصل سے تقابل کے بغیر لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیا... [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۹۴]

حالانکہ اقبال نے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو سلیمان ندوی ہی کو لفظ ''ارتفاقات'' کے حوالے سے لکھا تھا:

> مولانا شبلی نے ایک جگہ اس لفظ کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا ہے۔ اُردو ترجمے سے یہ نہیں کھلتا کہ اصل مقصود کیا ہے۔ کل سیالکوٹ میں حجۃ اللہ البالغہ مطالعے سے گزری۔ اُس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں... میرا مقصد شاہ صاحب کا مقصد سمجھنا ہے۔ مہربانی کر کے اُسے واضح فرمایئے۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۲۰۰]

اِس خط سے نہ صرف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اصل کتاب کا مطالعہ بھی کیا تھا بلکہ سلیمان ندوی کے ساتھ اُن کی خط وکتابت کی نوعیت بھی سمجھ میں آتی ہے جو اُس سے بہت مختلف ہے جو تاثر ہمیں امالی میں دیا جا رہا ہے۔

۴

سید سلیمان ندوی صاحب کے نام اقبال کے کل ۷۱ خطوط دستیاب ہیں جنھیں اُنھوں نے اقبال کی وفات کے بعد اپنے حواشی کے ساتھ اقبالنامہ میں اشاعت کے لیے دیا تھا۔ اِن حواشی میں کہیں ذکر نہیں کیا کہ اقبال نے خطبات کے مباحث سے رجوع کر لیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک پھیلے ہوئے ۷۱ خطوط میں اقبال نے ساٹھ سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر قدیم علوم سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ اُن کا مطالعہ کر رہے تھے یا مطالعے کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نمونے کے لیے ایک خط ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا تھا:

> والا نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ رسالہ اتقان فی ماھیة الزمان آج مل گیا۔ میں نے اُس کے لیے ایک دوست کو ٹونک لکھا تھا۔ آج مولوی برکات احمد کو ایک رسالے کے لیے جو اُردو میں ہے، لکھا ہے۔ ہندی فلسفی ساکن پھلواری، مصنفِ تسمویلاتِ فلسفہ کا نام کیا ہے؟ اور کتابِ مذکور طبع ہوئی یا نہ؟ اگر نہیں طبع ہوئی تو قلمی نسخہ اِس کا کہاں سے دستیاب ہوگا؟ مہربانی کر کے جلد مطلع فرمائیں۔
>
> شرح مواقف دیکھ رہا ہوں۔ فتوحات کا مطالعہ آپ کا مخلص آنے کے بعد دیکھوں گا۔ خدا کرے آپ کی صحت اچھی رہے اور آپ اِس طرف جلد توجہ کر سکیں۔ نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان، جو رامپور میں ہے، کس زبان میں ہے؟ قلمی ہے یا مطبوعہ؟ نور الاسلام کا زمانہ کون سا ہے؟ اِس تصدیع کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟ دار المصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے۔ اِس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔
>
> والسلام۔ مخلص، محمد اقبال۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۲۰۳-۲۰۲]

مخلص محمد اقبال تو اپنے خطوط میں یوں لکھا کرتے تھے مگر دیکھیے امالی میں سلیمان ندوی سے کیا روایت منسوب کی جاتی ہے:

> اقبال مرحوم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مختلف متحارب گروہوں کے لوگوں سے خط وکتابت کرتے تھے اور اس خط و کتابت سے حاصل شدہ معلومات کے تبادلے سے کچھ مفروضات قائم کر کے اپنی ذہانت سے بعض غیر معمولی نتائج اخذ کر لیتے۔ اُن میں وہ علمی اہلیت نہیں تھی کہ ان نکات کی

تائید و تصدیق متعلقہ کتب سے براہِ راست کر سکتے۔

[ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۸-۵۷]

مزید فرماتے ہیں:

ماجد صاحب کا خیال تو یہ تھا کہ اقبال مرحوم خطبات لکھنے کے زمانے میں مغربی فلسفے کے جدید انداز سے واقف نہ تھے۔ سیاسی مصروفیات اور وکالت اور شاعری کے بعد وقت کہاں ملتا ہوگا لہٰذا مغربی فلسفے کے بدلتے ہوئے جدید رجحانات تک اُن کی رسائی نہ تھی...[ساحل: جون ۲۰۰۶،ص ۹۶]

اِس غیر سنجیدہ بیان پر کس طرح تبصرہ کیا جائے؟ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں امالی کا بزرگ اُس قسم کی نفسیات کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کا خاکہ ابنِ انشا نے اپنے طنز میں پیش کیا ہے۔ چونکہ امالی کا یہ حصہ ملفوظات وغیرہ سے نکل کر فکشن بلکہ ابسرڈ فکشن کی حدوں تک پہنچ جاتا ہے لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے بھی ہم کسی مزاح نگار کے بنائے ہوئے خاکے ہی کا سہارا لے سکتے ہیں۔ اقبال کی وفات کے بعد من گھڑت روایات بیان کر کے اپنا قد بڑھانے والے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے ابنِ انشاؔ ایک ایسی ہی فرضی شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہیں:

ڈاکٹر لکیر الدین فقیر کو لیجیے۔ جیسے اور پروفیسر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط اتنا جانتے تھے کہ علامہ اقبال کے ہاں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ سو یہ بھی خصوصیت کی کوئی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفے کا دقیق مسئلہ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تو اِنہی سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر لکیر الدین فقیر نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز آدھی رات کو میں چونک کر اُٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ مرحوم کا خادمِ خاص علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا۔''خیریت؟'' جواب ملا،''علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔''میں نے کہا،''اِس وقت؟''بولا۔''جی ہاں اِس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا۔''میں حاضر ہوا تو اپنے لحاف میں جگہ دی اور فرمایا۔''آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازیؔ کا ذکر کیا۔ تم تو جانتے ہو میں شاعر آدمی ہوں۔ آخر کیا کیا پڑھوں؟ اِس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازی کون صاحب تھے اور اِن کا فلسفہ کیا تھا؟ میں دل ہی دل میں ہنسا کہ دیکھو اللہ والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہرحال تعمیلِ ارشاد میں میں نے امام فخر الدین رازی اور اُن کے مکتبِ فکر کا سیر حاصل احاطہ کیا اور اجازت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آئے، آبدیدہ ہو کر رخصت کیا اور کہا۔''تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب اِس شہر میں اور کون رہ گیا ہے جس سے کچھ پوچھ سکوں۔''اگلی اتوار کو زمیندار کا پرچہ کھولا تو صفحۂ اول پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ مصرع ہے:

غریب اگرچہ ہیں رازیؔ کے نکتہ ہائے دقیق

ہرچند میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازی کا فلسفہ خاصا پیش پا افتادہ ہے۔ دقیق ہرگز نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے، علامہ مرحوم

کوایسا ہی لگا۔ [ابنِ انشا: خمارِ گندم، ص ۸-۲۷]

ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی کتنے بڑے بڑے بزرگوں کو پروفیسر لکیرالدین فقیر بنا کر پیش کررہے ہیں۔ امالی والے بزرگ جو کوئی بھی ہیں اُن سے یہی کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اپنی حقیقت سے نقاب اٹھائیں کیوں کہ:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اقبال دشمنی

ا

یہ میدان ڈاکٹر ایوب صابر کا ہے۔ وہی اِس کا صحیح حق ادا کر سکتے ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر واضح کر سکتے ہیں کہ ان امالی کے پیچھے کون سے محرکات چھپے ہوئے ہیں اور اِن کی کڑیاں اقبال دشمنی کی مختلف روایات میں کہاں کہاں جا کر ملتی ہیں۔ یہاں صرف ایک آدھ مقام کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جس میں امالی کے بزرگ بلا وجہ اقبال کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنی بات اِس کے بغیر بھی کہہ سکتے تھے:

اقبال مرحوم مغرب کے فیمنزم سے شدید متاثر تھے۔
[ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۵۳]

سبحان اللہ! متاثر بھی نہیں، شدید متاثر؟ اِس بات پر ہمیں کتنا ہنسنا چاہیے؟ چلیے یہ تو معلوم ہوا کہ امالی کے بزرگ فیمنزم کے معانی نہیں جانتے مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک مغربی نظریہ جس کے معانی سے آپ واقف ہی نہیں اُسے صرف اِس لیے اقبال کے سر تھوپ دیں کہ اقبال کی کسی بات سے آپ کو اختلاف ہے؟ یہاں خواتین کے بعض حقوق کی بات ہورہی ہے جن کے بارے میں اقبال سمجھتے تھے کہ وہ اسلام نے دیے ہیں۔ امالی کے بزرگ کے خیال میں نہیں دیے۔ چنانچہ بے تکلف فرما دیتے ہیں کہ اقبال مغرب کے فیمنزم سے ''شدید متاثر'' تھے!

دلچسپ بات یہ کہ یہاں امالی کے بزرگ جو سید سلیمان ندویؒ کا روپ دھارے بیٹھے ہیں وہ اصل سید سلیمان ندویؒ کی ایک مستند تحریر سے بھی اختلاف کر بیٹھے ہیں۔ یہ مسئلہ طلاق کے حقِ تفویض کا ہے۔ اقبال نے ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء کے خط میں سید سلیمان ندویؒ صاحب سے دریافت کیا تھا:

فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اُس کے کسی خویش یا کسی اور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ اِس مسئلے کی بنا کوئی آیتِ قرآنی ہے یا حدیث؟
[اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۱۹۳]

سید سلیمان ندوی صاحب نے یہ خط اقبال نامہ کے مرتب کے سپرد کرتے ہوئے اِس حصے پر مندرجہ ذیل حاشیہ تحریر کیا:

تصریح تو احادیث میں ہے مگر قرآن پاک سے استنباط ممکن ہے۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان

ندوی کی نظر میں، ص۱۹۳]

اب امالی والے بزرگ کی سنیئے:

فقہ اسلامی میں طلاق کے مسئلے کی تاریخی تحقیق سے بھی اقبال مرحوم گہری واقفیت نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے وکالت کے پیشے میں جب طلاق کے مقدمات کثرت سے دیکھے تو اِس ضمن میں فقہی احکامات سے متنفر ہوگئے۔ احکام کی علت اور روح سمجھے بغیر محض چند واقعات وحادثات سے مضطرب ہو جانا دین کا مزاج نہیں ہے۔ عورت طلاق لیتی ہے مرد طلاق دیتا ہے۔ یہ فقہ کا اصول نہیں قرآن کا حکم ہے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص۵۳]

اب ہم اِسے کیا سمجھیں۔ سید سلیمان ندویؒ صاحب نے اقبال کے خط پر حاشیے میں جو لکھا وہی اپنے جوابی خط میں بھی لکھا ہوگا جس سے اقبال کے خیال کو تقویت ملی ہوگی اور حقِ تفویض پر اُن کا اصرار بڑھا ہوگا جو اُس زمانے میں کافی مشہور ہوا اور بالآخر حکومتِ پاکستان کے قائم کیے ہوئے عائلی قوانین کے کمیشن میں غالباً اقبال کے معتقد خلیفہ عبدالحکیم کے اصرار کی وجہ سے ۱۹۵۴ء میں شامل ہوا۔ اُس زمانے میں کئی علمأ نے اِس کمیشن کی رپورٹ کی مخالفت کی مگر بالآخر کئی سال کے تعطل کے بعد ۱۹۶۱ء میں صدر ایوب خاں نے اِسے مسلم عائلی قوانین کے آرڈیننس کا حصہ بنا دیا۔ اب ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اقبال اِس حقِ تفویض کی حمایت کرتے تھے اور شاید اُنھی کی تحریک کی وجہ سے یہ آج پاکستان کے عائلی قوانین کا حصہ ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سید سلیمان ندوی صاحب حدیث میں اِس حق کی تصریح پاتے تھے اور قرآن سے اِس کا استنباط ممکن جانتے تھے (کم سے کم اقبال نامہ میں اُن کے لکھے ہوئے حاشیے سے یہی ظاہر ہے)۔ پھر یہ کون بزرگ ہیں جن کی روح امالی میں حلول کر کے بول رہی ہے؟ اگر یہ سید سلیمان ندویؒ نہیں ہیں تو کیوں اپنے آپ کو سید سلیمان ندویؒ ظاہر کرنا چاہتے ہیں؟ کیا حقِ تفویض کے معاملے میں اِن کی بداحتیاطی ہمیں اِن کی اصل شناخت میں مدد دے سکتی ہے؟

حقِ تفویض جس کی وجہ سے اقبال کو مغرب کے فیمنزم سے شدید متاثر قرار دیا جارہا ہے اقبال اور سید سلیمان ندوی کی خط وکتابت میں کسی اور طرح بحث میں آیا ہے۔ میں نے اقبال کے خط سے جو اقتباس پیش کیا ہے اُس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امالی کے بزرگ اِس بات کو جس رنگ میں پیش کر رہے ہیں وہ کتنا غلط اور اصل واقعے سے کتنی دُور ہے۔ مگر یہ بزرگ اِس پر اکتفا نہیں کرتے۔ آگے بڑھ کر اپنے مخصوص انداز میں مزید معروضات پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز وہ ہے جسے عام زبان میں بال کی کھال نکالنا کہتے ہیں اور جس میں کسی لفظ کے لغوی بکھیڑے میں اُلجھا کر حاضرین کو اصل حقیقت سے دُور لے جایا جاتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

طلاق دینا حق نہیں ایک ضرورت ہے اور ایسی ضرورت جو انتہائی ناگزیر حالات میں زیرِ عمل آتی ہے۔ اقبال مرحوم حق اور ضرورت میں فرق نہیں کرسکے کیوں کہ اِس باریک فرق کو

سمجھنے کے لیے فقیہانہ نظر ضروری ہے۔[ساحل: جون ۲۰۰۶،ص۵۳]

ملاحظہ کیجیے۔ وہ سید سلیمان ندویؒ صاحب جنہیں ہم تاریخی طور پر جانتے ہیں صاف کھرے لہجے میں کہہ دیتے ہیں کہ حقِ تفویض کی تصریح تو احادیث میں ہے مگر قرآن پاک سے استنباط ممکن ہے۔ اس کے برعکس یہ امالی کے بزرگ لفظوں کی دھر پٹک سے ایک اور سماں باندھ دیتے ہیں۔

۲

سمجھنا چاہیے کہ امالی والے بزرگ نے جہاں جہاں فرمایا ہے کہ اقبال اپنے خطبات میں مغربی فلسفے سے متاثر دکھائی دیتے ہیں وہاں بھی بس اِسی بھرو سے یہ الزام لگایا ہو گا کہ جو بات بھی آپ کے مفاد کے خلاف ہو وہ ضرور مغرب سے آئی ہو گی۔ اقبال کو فیمنزم سے شدید متاثر کہنے پر امالی کے بزرگ کا پول کھل جاتا ہے اور اُن کی ہر بات پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خود فرماتے ہیں:

> مغربی فکر و فلسفے سے مجھے زیادہ شغف نہ تھا۔ یہ الگ میدان ہے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص۸۴]

تو پھر آپ نے جگہ جگہ جو اقبال کا محاکمہ کیا ہے کہ وہ فلاں فلاں مغربی فلسفی سے متاثر ہیں (جبکہ اقبال اِس کی تردید کرتے ہیں)، یہ کس بنیاد پر؟ آپ اقبال کو الزام دیتے ہیں کہ وہ بقول آپ کے عربی زبان اور اسلامی علوم سے واقفیت حاصل کیے بغیر اِن علوم پر تنقید کر رہے ہیں مگر آپ خود اقبال پر اپنی تنقید کو صرف اپنے میدان یا علومِ نقلی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جگہ جگہ آپ کی تان اِسی بات پر ٹوٹتی ہے کہ اقبال نے یہ بات فلاں فلاں مغربی خیال سے متاثر ہو کر کہی، یہ بات فلاں سے متاثر ہو کر کہی۔ اگر آپ کا مقصد صرف خطبات کی غلطیوں کی اصلاح ہوتا تو آپ ایسا نہ کرتے۔ آپ تو اقبال کی ایک فلسفی کی حیثیت سے باقاعدہ کردار کشی کر رہے ہیں اور اُلٹا سیدھا جو بھی تیر آپ کے ہاتھ میں آتا ہے اُسے چلانے کے درپے ہیں خواہ وہ تیر کسی بھی طرف نکل جائے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> اقبال مرحوم لکھتے ہیں کہ جمہوریت کا اصل ماخذ تو اسلام اور عہدِ خلافتِ راشدہ ہے۔ جمہوریت کی بنیادیں اُس زریں عہد میں تھیں، امیہ اور عباسی اس میں رکاوٹ بن گئے، اب مغرب میں جمہوریت ہے، پارلیمنٹ کا ظہور ہماری ہی روایت کا ظہور ہے لہٰذا جمہوریت کا خالق مغرب نہیں اسلام ہے۔ یہ بھی بے بنیاد دعویٰ ہے۔ جمہوریت اور جمہوری عمل کا اسلام سے کیا تعلق اور خلافتِ اسلامی سے کیا تعلق؟ [ساحل: جون ۲۰۰۶،ص۶۴-۶۳]

اقبال سے کیا پوچھتے ہیں، اگر آپ سید سلیمان ندویؒ ہوتے تو اپنے اُستاد سے پوچھتے۔ الفاروق میں شبلی نعمانی نے بحث کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت شخصی تھی یا جمہوری اور لکھا ہے کہ ''اگرچہ اُس وقت عرب کا تمدن جس حدتک

پہنچا تھا اُس کے لحاظ سے حضرت عمرؓ کی خلافت پر جمہوری یا شخصی دونوں میں سے کسی ایک کا اطلاق بھی نہیں ہوسکتا''، مگر اِس بات کا پتا لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کا انداز جمہوریت سے ملتا تھا یا شخصی حکومت سے۔ اِس کے بعد شخصی حکومت کی پہچان بتائی ہے کہ اُس میں عوام کی مداخلت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے شخصی حکومت میں تمام اشخاص کی قابلیتیں بروئے کار آنے کا موقع نہیں ہوتا، قوم کے اکثر افراد سے انتظامی قوت اور قابلیت معدوم ہونے لگتی ہے، لوگوں کے حقوق کی اچھی طرح حفاظت نہیں ہوتی اور قوم میں ذاتی اغراض کے سوا قومی کاموں کا مذاق معدوم ہو جاتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اِس کے برعکس ہوتا ہے مگر حضرت عمر سے پہلے عرب میں جمہوریت کا مذاق نہ تھا اور:

> حضرت عمر کے گردوپیش میں جو سلطنتیں تھیں وہ بھی جمہوری نہ تھیں۔ ایران میں تو سرے سے کبھی یہ مذاق ہی نہیں پیدا نہیں ہوا۔ روم البتہ کسی زمانے میں اِس شرف سے ممتاز تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے سے پہلے وہاں شخصی حکومت قائم ہوچکی تھی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تو وہ بالکل ایک جابرانہ خودمختار سلطنت رہ گئی تھی۔ غرض حضرت عمر نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی اور اگرچہ وقت کے اقتضاً سے اس کے تمام اصول وفروع مرتب نہ ہو سکے تاہم جو چیزیں حکومتِ جمہوری کی روح ہیں سب وجود میں آ گئیں۔ [شبلی نعمانی: الفاروق]

نہیں معلوم امالی کے بزرگ نے کبھی ڈاکٹر غلام محمد سے الفاروق کے مباحث کا ذکر بھی کیا یا یہ سمجھا کہ شبلی نے بھی رجوع کر لیا ہوگا!

۳

پڑھے لکھے بے خبر ہمیشہ اقبال کو نطشے کا خوشہ چین کہ کر اپنی معراج کو پہنچتے ہیں، پھر امالی کے بزرگ کیوں کر پیچھے رہتے۔ اِس اعتراف کے باوجود کہ مغربی فکر و فلسفہ آپ کا میدان نہیں، آپ یہ کہنے سے نہیں چوکتے:

> اقبال مرحوم ایک تہذیب کی تاریخ کو دوسری تہذیب کی تاریخ میں ضم کرنا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں۔ مغرب وجدان اور جبلت میں فرق کرتا ہے اور مغربی فلسفہ جبلتوں کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ نطشے کو پاگل قرار دے کر قید کیا گیا، اب پورا مغرب پاگل ہو گیا ہے کیونکہ جدید مغرب نے نطشے کے فلسفے کو اختیار کر لیا ہے، جمالیات اور جبلتیں ہی حقیقتِ مطلقہ کا متبادل ہیں۔ پاگل پن کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کی نظر میں ہر وہ شخص جاہل، غیر عقلی، وحشی اور دائرۂ انسانیت سے خارج ہے جو مسائل کا حل مذہب، الہامی متن، کسی روایت یا کسی خارجی ذریعے میں ڈھونڈتا ہے، لہٰذا ایسا انسان مغربی انسان کی تعریف کے پیمانے پر پورا نہیں اترتا اور واجب القتل ہے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، ص ۵-۷۴]

چلیے مغرب آپ کو معاف کر دے گا جب اُسے

معلوم ہوگا کہ آپ کی اصل دشمنی اقبال سے تھی۔ مغرب کو آپ نے صرف اِس لیے مطعون کیا کہ جو لوگ آپ کے دلائل میں وزن محسوس نہ کریں وہ اِسی بہانے اقبال سے متنفر ہو جائیں۔ آپ چاہتے ہیں ہم اِس بے ربط ہرزہ سرائی کو خیام اور حیاتِ شبلی کے مصنف سے منسوب کریں؟

سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مودودی

امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے منسوب مندرجہ ذیل ملفوظات پر غور کیا جا سکتا ہے:

> مولانا مودودیؒ نے مسئلہ قومیت اور اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی لکھ کر دراصل مسلم ماڈرن ازم کے کلیدی دعوؤں پر ضرب لگائی تھی، بلکہ میرا خیال ہے کہ اسلامی تہذیب و مبادی اقبال مرحوم کے خطبات کا ایک سطح پر جواب بھی ہے...مولانا مودودیؒ کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اقبال مرحوم کے پیدا کردہ مسلم ماڈرن ازم کے مکتبِ فکر کی یلغار کو روکا اور اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تحریکی دعوت کے ذریعے انگریزی خواں طبقات میں مسلم جدیدیت پسندی کی تحریک کا قلع قمع کر دیا۔ ان کی خامیاں اور کمزوریاں اپنی جگہ ہیں، انبیاؑ کے سوا کون خامیوں سے مبرا ہے۔ میں نے معارف میں ان کے فکر کا سخت محاکمہ کیا ہے اور اُن کی غلطیوں پر بار بار گرفت کی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اقبال مرحوم کی نثر کے منفی اثرات کو جدید تعلیم گاہوں میں مولانا مودودی کی کتابوں نے زائل کر دیا بلکہ سنا ہے کہ جماعت کے یہاں اہلِ علم خطبات کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں۔
>
> [ساحل: جون ۲۰۰۶ء، ص ۷-۷۶]

ساحل میں امالی جس طرح شائع ہوئے ہیں اُس میں کئی جگہ مودودی کے بعد ''ؒ'' کا نشان ڈالا گیا ہے۔ اگر یہ امالی سید سلیمان ندویؒ کی زندگی ہی میں محفوظ کیے گئے تھے تو اصل کاغذ پر یہ نشان موجود نہ رہا ہوگا کیونکہ یہ عام طور پر کسی کی وفات کے بعد ڈالا جاتا ہے۔ بہرحال یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ اصول و مبادی ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی اور گمان غالب ہے کہ خطبات سے الگ آزادانہ تحریر ہے۔ اسے ''خطبات کا ایک سطح پر جواب'' قرار دینا، بیان واقعہ سے زیادہ کچھ اور لگتا ہے۔

مولانا مودودی پر سید سلیمان ندوی کی تنقید سے میں بہت زیادہ واقف نہیں ہوں۔ ممکن ہے کوئی اور محقق اِس حوالے سے امالی پر روشنی ڈال سکے مگر بہرحال یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ جن بزرگ کے افکار کا سید سلیمان ندویؒ صاحب نے اپنی مطبوعہ تحریروں میں ''سختی سے محاکمہ'' کیا ہو اُنھیں تو سید سلیمان ندویؒ کا ہیرو بنا دیا جائے اور جس مفکر کے خلاف کبھی ایک لفظ نہ لکھا ہو، جس کے شعر سے علم کلام اخذ کیا ہو اور جس کی وفات پر اُسے صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکیم قرار دیا ہو، ''وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے،'' اُس کے بارے میں تسلیم کر لیا جائے کہ سید سلیمان ندویؒ کی نظر میں اُس کے افکار تمام

مذہبی معاشروں کے لیے بالعموم اور اسلامی معاشروں کے لیے بالخصوص ایسا خطرہ ہیں کہ اگر عام ہو گئے تو دین کی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔

اگر ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی کو مستند مان کر سمجھا جائے کہ یہ ملفوظات سید سلیمان ندویؒ صاحب کے ہیں جو اُنہوں نے بقائمی ہوش و حواس کسی کے گوش گزار کیے تھے تو پھر سید سلیمان ندویؒ صاحب کی تمام مطبوعہ تحریروں کی اہمیت صفر کے برابر بھی نہیں بلکہ منفی ہو جاتی ہے کیونکہ ہمیں ہمیشہ شبہ رہے گا کہ وہ جس چیز کی مخالفت کر رہے ہیں اُسی میں اُمتِ مرحوم کی نجات سمجھتے ہیں اور جسے کوثر و تسنیم کا پیالہ کہہ رہے ہیں دراصل اُسے مذہب کو تباہ و برباد کرنے والا زہریلا شربت سمجھتے ہیں۔

مدیرِ ساحل کے معروضات

۱

ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی کے نام سے پیش کردہ تحریر غلطیوں کا طومار ہے۔ مدیرِ ساحل حسنِ ظن میں بھروسہ کر بیٹھے چنانچہ اُنہوں نے سرورق پر جو طویل عبارت درج کی ہے اُس میں پیش کیے گئے نتائج بھی تاریخی طور پر غلط ہیں۔ سرخی ہے، ''حضرت اقبال نے خطبات کے مباحث سے رجوع کر لیا تھا۔''، تفصیل اس اجمال کی یوں پیش ہوئی ہے:

> خطبات میں پیش کردہ افکار، نظریات اور فلسفے سے اقبالؒ قلبی طور پر مطمئن نہ تھے۔ سید سلیمان ندویؒ سے ان کی خط و کتابت اِسی ذہنی خلجان، فکری بحران اور روحانی عدم اطمینان کی نشان دہی کرتی ہے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، سرورق]

یہ درست نہیں ہے۔ سید سلیمان ندویؒ کے نام اقبال کے خطوط میں کہیں اُن باتوں کا شائبہ بھی نہیں گزرتا جن کی طرف مدیرِ ساحل اشارہ کر رہے ہیں۔ آپ ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی کو مستند سمجھنے کے بعد عجلت میں اُس خط و کتابت کی طرف رجوع نہیں کر سکے ورنہ آپ کو مغالطہ نہ ہوتا اور آپ یہ بات ہرگز نہ لکھتے۔ اگر اپنے نتائج پر اصرار قائم رکھتے تب بھی اِس بات کو کسی اور طرح کہنا پسند کرتے۔ مزید کہتے ہیں:

> سید سلیمان ندویؒ سے خط و کتابت، گفتگو، مولانا ماجد دریا ابادی کے اعتراضات پر علامہ اقبال کا تکدر، تحیر اور تذبذب دیدنی تھا۔ علما کرام کے شبہات و سوالات کی روشنی میں اقبال تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامی کے بیشتر مباحث سے رجوع کر چکے تھے۔ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے استقبالیہ مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۳ء سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے رجوع کا ذکر نہایت لطیف پیرایے میں کیا۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶، سرورق]

یہاں وہ پورا اقتباس دیا گیا ہے جسے ہم پہلے دیکھ آئے ہیں اور جانتے ہیں کہ جب اقبال نے یہ بات کہی اُس وقت وہ خطبات سے رجوع کرنے کی بجائے اُس کے آکسفورڈ اڈیشن کی تیاری کر کے آئے تھے اور اس کے بعد

نئے اڈیشن کے لیے مسودہ صاف کرتے ہوئے اُنہوں نے لفظی ترامیم کیں مگر کوئی بنیادی تبدیلی معانی میں کی نہ متن میں۔ ساتویں خطبے کا اضافہ بھی کیا جس کی منہاج پچھلے خطبات سے مختلف نہ تھی۔ نیا اڈیشن اگلے برس شائع بھی ہو گیا۔

اقبال کے بارے میں اعتراضات کرنے والے کسی نہ کسی کایا پلٹ کو اُن سے منسوب کرتے آئے ہیں جبکہ اقبال کے یہاں خیالات کا تسلسل ہے، ارتقا ہے مگر زندگی کے کسی دَور میں کوئی ایسا انقلاب ہرگز نہیں ہے جس میں رُخ شمال سے جنوب کی طرف گھوم گیا ہو۔ لڑکپن سے بسترِ مرگ تک ہر خیال دوسرے سے پیوستہ ہے۔ جس زمانے میں 'ہندوستان ہمارا' لکھ رہے تھے اُنھی دنوں اپنے مضمون 'قومی زندگی' میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو علیحدہ قوم بھی قرار دے رہے تھے۔ آگے چل کر 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' لکھی تو اُسی زمانے میں 'رام'، جب 'طلوعِ اسلام' لکھی تو اُسی دَور میں 'نانک'۔ اقبال کبھی نہیں بدلا، زمانہ بدلتا رہا اور ہر دَور میں اقبال کو اپنی آواز سمجھتا رہا۔ اگر آپ کا دل چاہے تو اُس پرانے اعتراض کے دامن میں پناہ لیجیے کہ اقبال کی فطرت میں بڑے تضاد تھے۔ لیکن اگر دل چاہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ جو خاک عشق کی آشفتگی سے صحرا بنتی ہے وہ پھیلتی ہے اور جب سمندر کی موج اپنے کندھے پر ٹوٹتی ہے اُس وقت بھی موج ہی رہتی ہے، ساحل نہیں بن جاتی۔

۲

ســاحل کے سرورق کی عبارت میں یہ خیال بھی ملتا ہے:

> اقبال اور نذیر نیازی کی مراسلت اِس بات کو ثابت کرتی ہے کہ علامہ اقبال خطبات پر نظرِ ثانی کر کے اِسے دوبارہ لکھنا چاہتے تھے لیکن زندگی نے اُنہیں نظرِ ثانی کی مہلت نہ دی۔ سہیل عمر کی تحقیق بھی اِس نقطۂ نظر کی تائید و توثیق کرتی ہے۔ [ســاحــل: جون ۲۰۰۶، سرورق]

نذیر نیازی اقبال کے حاضر باش تھے جنہوں نے خطبات کی پہلی اشاعت کے بعد ہی اُن کا اُردو ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ اقبال کے آخری دنوں میں تو اقبال کی گفتگوؤں کا روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ اُن کے نام اقبال کے خطوط کو اگر آپ ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے منسوب کیے گئے ملفوظات کی روشنی میں جلدی جلدی پڑھیں تو شاید یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ اقبال خطبات پر نظرِ ثانی کرنا چاہتے تھے۔ مگر غور سے مطالعہ کریں تو یہ تاثر پیدا نہیں ہوتا اور خود نذیر نیازی کی رائے بھی یہی ہے۔ خطبات کے ترجمے کے مقدمے میں انتہائی واضح طور پر وہ ایسے کسی خیال کی پیش بندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرتِ علامہ [اقبال] کا خیال اُنہیں مطالب کو جو

خطبات میں ادا کیے گئے اور زیادہ وضاحت، بلکہ ایک حد تک نئے انداز میں پیش کرنے کا تھا۔ مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حضرتِ علامہ خطبات سے غیر مطمئن تھے۔ اُن کا خیال تھا تو یہ کہ اسلامی فکر کی تشکیل جس نہج پر ہونی چاہیے اُس کے لیے ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے۔ لہٰذا خطبات میں بہت سی بحثیں اگر تشنہ رہ گئی تھیں، یا تشنہ چھوڑ دی گئیں تو اِس امید میں کہ اربابِ نظر خود اُن کو پھیلا کر سلسلۂ استدلال مکمل کر لیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں اور یہی حقیقی وجہ تھی اُن کے اضطراب کی۔ [سید نذیر نیازی (ترجمہ): تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص۱۰]

یہ ترجمہ اقبال کی زندگی میں ۱۹۳۰ء کے قریب شروع ہوا تھا مگر ۱۹۵۷ء میں پہلی بار مکمل شائع ہوا۔ ممکن ہے اُس وقت تک خطبات کے حوالے سے غلط فہمیاں پھیلانے کے لیے روایات سازی کا کوئی سلسلہ شروع ہو چکا ہو اور اُسی کا احساس کرتے ہوئے سید نذیر نیازی نے یہ وضاحت پیش کی ہو تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

جہاں تک سہیل عمر کی بات ہے تو اُن کی کتاب خطباتِ اقبال نئے تناظر میں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اقبال کے خطبات اور شاعری کے درمیان ربط تلاش کرنا چاہیے کیونکہ یہ دونوں چیزیں کسی دولخت شخصیت کا شاخسانہ نہیں بلکہ ایک ہی ذہن کی پیداوار ہیں۔ شاعری اُن نکات کی وضاحت کرتی ہے جو خطبات میں مبہم رہ جاتے ہیں۔ اِس طرح سہیل عمر کی کتاب تو اُس ذہنی رویے کی نفی کرتی ہے جو ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی میں سید سلیمان ندویؒ سے منسوب کیا گیا ہے، یعنی ''ہم نے کیا پوری اُمت نے اقبال مرحوم کی لغزشوں اور خطاؤں کے عظیم مجموعے خطبات کو بھلا دیا اور اُن کے خیرِ مسلسل کلامِ اقبالِ مرحوم کو رُوح میں بسا لیا۔''

اصل سلیمان ندوی

سید سلیمان ندویؒ (۱۹۵۳-۱۸۸۴) سے علامہ اقبال نے اسلامی علوم کی تحقیق میں کئی مشورے لیے تھے۔ اقبال کی شعری تصانیف پر سید سلیمان ندویؒ کے اولین تبصرے، شذرے بلکہ تقاریظ بھی شعرِ اقبال کی تفہیم میں دیر تک قائم رہنے والی بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔ حسنِ انتقاد کے جس معیار کو سید سلیمان ندویؒ نے اپنی اولین سطور ہی میں چھو لیا بعد کے اقبال شناسوں میں سے بہت کم وہاں تک پہنچ سکے۔

۱۹۲۴ء میں جب اقبال نے الٰہیاتِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی کوششوں کا آغاز کیا تو اُنہیں سید سلیمان ندویؒ کے بارے میں یہ حسنِ ظن تھا کہ وہ اُن افراد کا نمونہ ہیں جنہیں مستقبل میں آگے بڑھ کر اسلامی معاشروں کی تقویت کا سامان بننا ہے۔ اُنہی دنوں سید سلیمان ندویؒ صاحب کانگرس سے تازہ تازہ دل برداشتہ ہوئے تھے۔ ۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اقبال نے ایک خط میں انہیں لکھا:

یورپین افکار کی تاریخ کا اعادہ آج کل دنیائے اسلام میں ہو رہا ہے۔ اِن حالات میں جو اِس وقت کیفیت آپ کے قلب کی ہے، وہ ایک حد تک نیچرل امر ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کام کر رہے ہیں وہ امتِ مسلمہ کے لیے از بس مفید ہے۔ دنیائے اسلام اِس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے۔ اِس پیکار و انقلاب کا رُخ متعین کرنے والے قلوب و اذہان پر شک و نا میدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا قلب قوی ہے اور ذہن ہمہ گیر۔ آپ اِس حالت سے جلد نکل جائیں گے۔ یا صوفیہ کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ اس مقام کو جلد طے کر لیں گے۔ آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے:

قلندراں کہ براہِ تو سخت می کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و ماہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
دریں جہاں کہ جمالِ تو جلوہ ہا دارد
زفرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

آپ اِس جماعت کے پیش خیمہ ہیں۔ اِس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ باقی جس راہ پر آپ اِس سے پہلے قدم زن تھے اُس کے متعلق ان شاء اللہ بوقتِ ملاقات گفتگو ہو گی۔ ہندوستانی نیشنلزم کی انتہا یہی تھی جو آپ کے مشاہدے میں آ گئی۔

[اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۱۸۱-۱۸۰]

سید سلیمان ندویؒ صاحب کی اقبال سے پہلی ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی مگر خط و کتابت کافی مدت پہلے سے جاری تھی۔ اُن کے نام اقبال کے ۷۱ خطوط دستیاب ہیں جو ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے گئے۔ اقبال کی وفات کے بعد اُنہوں نے خود یہ خطوط حاشیے لکھ کر مرتبِ اقبال نامہ کو فراہم کیے تھے۔ ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ اقبال سے اُن کی مراسلت ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی مگر ممکن ہے یہ یادداشت یا کتابت کی غلطی ہو اور مراسلت ۱۹۱۶ء ہی میں شروع ہوئی ہو۔ اِس خیال کو اِس بات سے تقویت ملتی ہے کہ اقبال کی پہلی مثنوی اسرارِ خودی جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی وہ کئی سال بعد بھی سید سلیمان ندویؒ صاحب کی نظر سے نہیں گزر سکی جبکہ ۱۹۱۶ء کے بعد شائع ہونے والی اقبال کی ہر کتاب فوراً ہی اُن تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ممکن کہ اُن کے نام اقبال کے خطوط ۱۹۱۶ء ہی سے شروع ہوئے ہوں اور جو شائع ہو کر ہمیں ملے ہیں بس وہی لکھے گئے۔ اقبال، سید سلیمان ندویؒ صاحب کے خطوط محفوظ رکھتے تھے مگر یہ اب اُن کے کاغذات میں دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی کہیں شائع ہو سکے۔

حاصلِ بحث

ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ کے امالی میں اگر سید سلیمان ندوی صاحبؒ کے ملفوظات نہیں ہیں تب بھی یہ خیالات کسی نہ کسی کا نتیجہ فکر تو ہوں گے۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ نے اپنی طرف سے لکھے ہوں یا کسی نے اُن کے نام سے یہ تہمت نامہ ترتیب دیا ہو، یہ جس کی زرخیزی طبع کا شاہکار بھی ہے، بہرحال ہمیں ایک ایسے ذہن کی سیر کرواتا ہے کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اِس قسم کا ذہن حرف و حکایت کی بافندگی کے علاوہ معاشرے کو اور کس قسم کے نقصان پہنچا سکتا ہے؟ اِس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔

یہ ایک مخصوص ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔ آیئے، اِسے اقبال کے علمِ کلام کی روشنی ہی میں سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ اقبال کا علمِ کلام کس طرح ہماری رہنمائی کر سکتا ہے اور کیوں سید سلیمان ندوی صاحبؒ اور دوسرے اکابرینِ ملّت، اقبال کو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکیم بھی مانتے تھے۔ امالی کے بزرگ خطبات سے نالاں ہیں مگر اقبال کی شاعری کو اُن کا کارنامہ کہتے ہیں تو ہم بھی اقبال کی شاعری ہی میں سے وہ کتاب اٹھا رہے ہیں جسے سید سلیمان ندوی صاحبؒ نے اقبال کا علمِ کلام قرار دے کر تعریف کی تھی۔ یہ رموزِ بیخودی ہے۔ جب پہلی بار شائع ہوئی تو اپریل ۱۹۱۸ء کے معارف میں اُن کا تبصرہ آیا جس میں لکھا تھا:

> ڈاکٹر اقبال نے جو اسرار و نکات اِس میں حل کیے ہیں اُن کی بنا پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔ توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُراثر اور تشفی بخش دلائل اِس کے اندر موجود ہیں۔ [اختر راہی، مرتب: اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص۶۱]

اِس میں توحید سے بحث کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے، ''یاس وحزن وخوف ام الخبائث است و قاطعِ حیات و توحید ازالۂ ایں امراضِ خبیثہ می کند'' یعنی ناامیدی، غم اور خوف سب برائیوں کی جڑ ہیں اور رشتۂ حیات منقطع کرنے والی ہیں اور توحید اِن امراضِ خبیثہ کا ازالہ کرتی ہے۔

اب دیکھیے کہ امالی والے بزرگ کا بنیادی محرک خوف ہے اور یہ اِسی کو دوسروں میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ اِن سے کچھ بھی پوچھیے۔ جواب یہ نہیں ملے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، بلکہ جواب ہوگا کہ فلاں بات کا خوف ہے۔ سوال، آپ اقبال کے خطبات کو مہلک سمجھتے تھے تو کبھی کہا کیوں نہیں؟ جواب، ملت سے اُس کا سہارا چھن نہ پائے۔ نعوذ باللہ، آپ سمجھتے ہیں کہ جس ملت کی بقا کا وعدہ خدا نے کیا ہے وہ اقبال کی شاعری کے بغیر ختم ہو جاتی؟ اِن بزرگ کے ذہن میں ہر چیز اِسی طرح نازک اور ہوا کے دوش پر

رکھی ہوئی ہے جسے کسی سانس کی ایک آنچ ختم کر سکتی ہے۔ اقبال کی شاعری جس کا شمار اُن کی زندگی ہی میں فن کے ہمیشہ رہنے والے شہپاروں میں ہونے لگا تھا وہ اِن بزرگ کے خیال میں ایسی نازک تھی کہ اگر اقبال کی نثر کے خلاف بھی یہ کچھ کہہ ڈالتے تب بھی وہ شاعری نابود ہو جاتی۔ اِسی طرح ملتِ اسلامیہ کو ایسا نازک سمجھتے ہیں کہ کبھی کہتے ہیں اقبال کے خطبات سے تہس نہس ہوگی، کبھی سمجھتے ہیں کہ مغرب اِسے کھائے گا، کبھی کوئی اور خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ اِس مکمل خوف اور تباہی کے ڈراؤنے خواب میں اِن بزرگ کے نزدیک ملت کا سہارا کیا ہے؟ خدا کا وعدہ نہیں، رسولؐ کی جلالت نہیں، لے دے کے اقبال کی شاعری ہے جو ملت کے زخموں پر مرہم رکھ رہی ہے۔ آپ ہی کے لیے اقبال کہہ گئے ہیں:

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی، اور کافری کیا ہے
خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

۲

املی کے بزرگ اپنے جو بھی عقائد بتائیں لیکن اگر اقبال کی شاعری کے بارے میں اِن کا نقطۂ نظر مان لیا جائے تو پھر عوام کو اقبال کی شاعری پر تنقید کا حق بھی نہیں رہتا اور وہ شاعری ایک ایسے مقام پر فائز ہو جاتی ہے جہاں صرف مقدس صحیفوں کو رکھنا چاہیے۔ اقبال جب شاعری کرتے ہیں تو شاعر ہیں، فلسفہ بولتے ہیں تو فلسفی ہیں اور آخرِ کار ایک انسان ہیں۔ یہ بزرگ اپنے اِدّعا کی تلوار سے اقبال کے دو ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ٹکڑا الوہیت کے قریب کسی مرتبے پر فائز ہوگا جسے علما کی اجازت کے بغیر کوئی چھو نہیں سکتا (یاد رہے کہ یہ بزرگ فرماتے ہیں، ''علما نے اُن کی شاعری کے بڑے حصے کو قبول کرلیا کہ یہ ٹھیک تھا۔ جو حصہ غلط تھا وہ غلط تھا'')۔ اقبال کے دوسرے حصے کو یہ اپنی نگرانی میں دریا برد کروائیں گے۔

مولانا ماجد کی تنقید والے افسانے میں املی کے بزرگ نے جس طرح پینترے بدلے ہیں وہ صحیح اور غلط میں تمیز اٹھ جانے کی واضح مثال ہے۔ ایک اور تکلیف دِہ مثال یہ ہے کہ اقبال کی جس بات پر بھی ناراض ہوئے اُسے مغرب کے کسی نظریے سے ماخوذ بتایا۔ یہ کوئی مخصوص ذہنیت ہے جس میں یہ لحاظ نہیں کیا جاتا کہ سوچ سمجھ کر بات کی جائے۔ کسی کے خیالات بیان کرتے ہوئے یا کسی معاشرے پر تنقید کرتے ہوئے پہلے حقائق جمع کرنا اور پھر اُنہی تک محدود رہنا ضروری نہیں۔ اِس ذہنیت کے مطابق کچھ مفروضوں کو مقدس بچھڑوں کی حیثیت دے دی جاتی ہے اور پھر آپ اُن مفروضوں کی حمایت کا دعویٰ کرتے ہوئے جو دل چاہے کہتے جایئے، وہ سچ ہو یا جھوٹ ہو آپ ضرور ثواب کے

مستحق قرار پائیں گے۔ خدا کی نظر میں تو شاید نہیں مگر اپنے ہم خیال ارباب من دُون اللہ کی نظروں میں ضرور۔

اِس رویے کا تکلیف دِہ پہلو یہ ہے کہ سننے والے کے ذہن کو بھی ایسا ہی معطل سمجھ لیا جاتا ہے۔ امالی والے بزرگ اپنے آپ کو اُس درجے پر فائز کر چکے ہیں جہاں اِن کی خاموشی نے اُمتِ مسلمہ کا سہارا قائم رکھا تھا لہٰذا اب سننے والوں سے بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ اِن کے بیانات کے اندرونی تناقضات کو محسوس نہیں کریں گے، وہ اِن کے معروضات کو جھوٹ سچ کے پیمانے پر نہ تولیں بلکہ اِن کی نیک نیتی کی روشنی میں اور اُمّتِ مسلمہ کو درپیش خطرے کے پیشِ نظر دَم سادھے سُنتے رہیں۔ یہی رویہ ہے جو اپنی مخالفت کرنے والے پر بے تکان گمراہی کا فیصلہ صادر کرتا ہے کیونکہ یہاں مخالفت یا موافقت کسی اصولی بنیاد پر نہیں ہوتی (جیسا کہ ان بزرگ نے بقول خود ایک عظیم فتنے پر زبان بند رکھی) بلکہ ہر چیز کسی مصلحت کے تابع ہوتی ہے۔ مصلحت کی سیڑھی پر کون سی چیز اوپر ہے اور کون سی نیچے ہے؟ اِس کا فیصلہ کرنے کے لیے پروہتوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ مثلاً اعلیٰ درس گاہوں میں عربی پڑھا کر بھی اقبال اِن بزرگ کی نظر میں یہ اہلیت نہیں رکھتے، مولانا ماجد رکھتے ہیں۔

اِسی اصول کے تحت یہ بزرگ کسی چیز کو مغربی فیمنزم سے شدید متاثر ہونا کہہ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا تو اصل خط و کتابت میں وہ مسئلہ قرآن و حدیث سے اخذ کیا ہوا نکلا اور اُسے سید سلیمان ندوی صاحب کی تائید حاصل تھی (امالی کے سید سلیمان ندویؒ نہیں بلکہ سچ مچ والے سید سلیمان ندویؒ)!

۳

سنہری بچھڑے بنانے کے فن میں جو اوزار کام آتے ہیں اُن میں وہ لغت کے بکھیڑے شامل ہیں جن کی مثال یہاں ملتی ہے۔ لسانی تحقیق دوسری چیز ہے، لغت کے بکھیڑے میں اُلجھانے کا فن اور ہے۔ جہاں حقیقت کچھ نہ ہو اور محض الفاظ کو حقیقت کا نعم البدل بنانے کی کوشش کی جائے وہیں سامریت کی ساحرانہ فنکاری ظہور میں آتی ہے اور اِسی کو اقبال لغت کے بکھیڑے کہتے ہیں۔ امالی کے بزرگ نے طلاق کے حقِ تفویض پر کس طرح بات کو اُلجھایا کہ طلاق حق نہیں ضرورت ہے اور اقبال اس فرق کو نہیں سمجھے۔ ہم نے سید سلیمان ندوی صاحبؒ کی اصل تحریر نکالی تو کہاں کا حق اور کہاں کی ضرورت، سیدھی سادھی تصریح حدیث میں دستیاب اور قرآن سے استنباط ممکن۔ مگر سامری کو اِس سے کیا غرض ہوگی کہ حدیث کا ابطال ہو رہا ہے یا قرآن کے معانی محدود ہو رہے ہیں۔

ایک اور مثال دیکھیے:

ہمیں مسلم ماڈرن ازم اور مسلم لبرل ازم میں فرق کرنا

چاہیے۔ مسلم ماڈرنسٹ نہایت مخلص، دین کے خادم، نیک نیت، امت کے لیے پریشان لوگوں کا گروہ ہے۔ اِس کے سرخیل اقبال مرحوم ہیں۔ یہ معجزات کو بھی مانتے ہیں، اسلام کے ماخذات پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہ مسلم جدیدیت پسند مغرب میں ایک روحانی خلا محسوس کرتے ہیں، اُس کی مادیت کو سراسر اسلام کا حاصل اور ثمر سمجھتے ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ مغرب ناکافی ہے کیونکہ اس نے اسلام سے علومِ عقلیہ، سائنس، تجربیت اور دنیا لے کر ترقی کر لی۔ مگر اسلام کی مکمل تعلیم یعنی روحانیت سے استفادہ نہ کیا، مغرب کے مقاصد درست ہیں لیکن اِس کی تکمیل اسلام کے نظامِ عبادات وروحانیات کے بغیر نہیں ہوسکتی، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ مغرب کے فلسفے سے اتنے متاثر ہیں کہ اِسے بھی اسلام میں یا اسلام کو مغرب میں سمونا چاہتے ہیں۔ مسلم لبرل ازم دوسری شے ہے، جس کی ابتدا کرامت جونپوری، چراغ علی، سرسید نے کی اور مشرقی، نیاز فتح پوری، عبدہ، جیراج پوری، غلام احمد پرویز اِس کی علامتیں ہیں۔ یہ نہایت بدنیت اور امت کے مخالف لوگ ہیں، یہ لوگ فکری اور علمی سطح پر نہایت کمزور ہیں۔ سرسید، عبدہٗ تو انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔ [ساحل: جون ۲۰۰۶ء ص ۷۷-۷۶]

اِس پُرفریب بیان کے ذریعے امالی کے بزرگ سب سے پہلے تو ایک غیر محسوس طریقے سے اپنے آپ کو ایسے بلند مقام پر فائز کر لیتے ہیں جہاں سے پورے عالمِ اسلامی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تحریکوں کے سربراہوں میں سے جسے چاہے مکھی کی طرح دُودھ سے باہر نکال پھینکیں اور جسے چاہیں اُسے پھینکنے سے پہلے دوسرا پر بھی دُودھ میں ڈبوئیں۔ پھر نیاز فتح پوری اور سرسید احمد خاں کو ایک ہی درجے پر فائز کرنا کس قسم کا رویہ ہے؟ آپ خود کو کسی ایسی ماورائے جہاں بلندی پر فائز سمجھتے ہیں جہاں سے نیچے دیکھتے ہوئے پست و بالا سب برابر دکھائی دیتے ہیں مگر ماڈرن ازم اور لبرل ازم کے بکھیڑوں میں اُلجھ کر خود منہ کے بل نیچے آ رہتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ آپ جن لوگوں کے نام لے رہے ہیں کیا انہوں نے کبھی یہ عنوانات اپنے لیے قبول کیے تھے؟ کیا اقبال نے کبھی مسلم ماڈرن ازم یا کسی قسم کے ماڈرن ازم سے اپنے آپ کو وابستہ قرار دیا تھا؟ پھر اِس خودساختہ ماڈرن ازم کی تعریف کے مرحلے سے تو آپ جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لے کر گزر گئے مگر جسے مسلم لبرل ازم کہہ رہے ہیں اُس کی سرے سے کوئی تعریف ہی نہیں کرتے سوائے یہ کہنے کے کہ ''یہ نہایت بدنیت اور امت کے مخالف لوگ ہیں، یہ لوگ فکری اور علمی سطح پر نہایت کمزور ہیں۔'' گالیاں دینے سے علمی اصطلاحیں وضع نہیں ہوا

کرتیں۔ اگر اصل سلیمان ندوی بھی ہوتے تو اُنہیں حفظِ مراتب کا پاس رکھنا لازم تھا۔ سرسید احمد خاں کا ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک مقام ہے اور اگر وہ بدنیت تھے تو پھر کس کی نیت پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟ ماڈرن ازم اور لبرل ازم کے الفاظ چُن کر جن کے مطلب سے بھی خدا جانے آپ واقف ہیں یا نہیں، آپ سننے والے کو مرعوب کرتے ہیں اور پھر اپنے مخالفین کو گالیاں دے کر کام نکالتے ہیں۔ پاسِ ادب سے اِس قدر منحرف کہ کس و ناکس کو ایک ہی سطح پر لے آئے ہیں۔

اقبال نے کہا ہے کہ دین ادب سے شروع ہوتا ہے اور اِس کی انتہا عشق ہے۔ ادب کا یہی رویہ ہماری روایت میں بڑی خوبصورتی سے بیان ہوا ہے کہ ہر میدان گھوڑے دوڑانے کا نہیں ہوتا بلکہ کہیں کہیں سپر ڈال دینے کا مقام بھی ہوتا ہے:

نہ ہر جا کہ مرکب تواں تاختن
جا ہا سپر باید انداختن

خطبات سے رجوع کا شوشہ بھی لغت کے بکھیڑے کا کرشمہ ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ اس کا کوئی شائبہ اقبال کے خطوط میں ملتا ہے نہ سوانح میں بلکہ شواہد اِس کے خلاف ہیں۔ امالی کے بزرگ سید ھے سادھے لفظوں میں بے پَر کی اُڑاتے تو اِتنی موثر نہ ہوتی مگر لفظ رجوع کا ملمع خوب رہا۔ یہ ایک مذہبی علمی اصطلاح ہے۔ یہاں اگرچہ بے بنیاد تھی مگر نگاہوں کو چکا چوند کر گئی اور کتنے ہی ذہن ایک باطل دعوے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوع اسلام کا مقصد

ہمارا مقصد یہ ہے کہ............

1- تنہا فکر انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

2- یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

3- حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

4- حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

5- قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

6- اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قران کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

7- اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔

8- ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تا کہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے ''قرآنی نظام ربوبیت'' کہا جاتا ہے۔

ابتداء پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تا کہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پاسکیں اور اس طرح ''زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے''۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں

تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

1- قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلا تمیز قوم' رنگ' نسل' پیشہ محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

2- کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی' اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

3- کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک' لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

4- معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

5- ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے' جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں' یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

6- ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

7- رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری عاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

8- ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں' لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد' نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

9- ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد و بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

10- یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

تحریک طلوع اسلام پاکستان میں اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوع انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے نظام کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کے لئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرمائیے۔

والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدی، راولپنڈی
mansoor_sarmadi@yahoo.com

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرھا

(جاوید غامدی صاحب کے فکر پر تبصرہ)

بہ آں قومے تومی خواہی کشادے[1]
فقیہش بے یقینے، کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے
اقبالؒ

ایمان کا دوسرا نام یقین ہے۔ یہ شک کی ضد ہے۔ علم و تحقیق کے نتیجے میں ریب و گمان و ظن کے زائل ہونے کے بعد کسی معاملہ کا یوں پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا کہ اس کے بعد دل میں کوئی خلش یا خلجان باقی نہ رہے، یقین کہلاتا ہے۔ دین کی ساری عمارت یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے کیونکہ اس کا ہر قانون، ہر اصل اور ہر حکم براہ راست خدا کی طرف سے نازل کردہ ہوتا ہے۔ ایک بندہ مومن کا ایمان اندھا یا الل ٹپ نہیں ہوتا بلکہ اس کی بنیادی خصوصیت ہی اس کا علیٰ وجہ البصیرت ہونا ہے۔ جبکہ مذہب کی عمارت ظن و تخمین کی رہینِ منت ہوا کرتی ہے۔ اس لیے دین یقینی ہوتا ہے جب کہ مذہب ظنی و قیاسی۔

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

خدا کی طرف سے تمام دنیا کے لوگوں کو دین انبیائے کرام کی وساطت سے وحی کی شکل میں ملا کرتا تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد، آہستہ آہستہ اس میں انسانی خیالات و اقوال کی آمیزش شروع ہو جاتی تھی اور اس میں سے یقین کا عنصر کم اور گمان و ظن کا عنصر غالب ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح سے رفتہ رفتہ دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ سب ادیان کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ بدقسمتی سے دین اسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ قرآن

---

[1] مفہوم: تو اس قوم سے وسعتِ نظر اور کشادگی کا خواہاں ہے جس کا فقیہہ (مذہبی پیشوا) بے یقین اور کم سواد ہے۔ بہت سی ایسی باتیں جو دیکھنے کے لائق نہیں تھیں، میں دیکھنے پر مجبور ہوں۔ اے کاش! مجھے ماں نے نہ جنا ہوتا! (اقبالؒ)

میں تو کسی قسم کے انسانی خیالات کی آمیزش نہ کی جا سکی کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ مگر دین اسلام کو مبدل بہ مذہب کرنے کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کیے گئے جن میں کا نمایاں ترین ذریعہ وضع روایات تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہی ہے کہ ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اس مقصد کے لئے ملت کے صاحبانِ جبہ و دستار کا بنیادی ہدف یہ رہا ہے کہ قرآنی تعلیمات، قرآنی اصطلاحات اور قرآنی تصورات کی ایسی متنوع، متبائن اور باہم دگر متضاد (Self-Contradictory) تفاسیر پیش کی جائیں جس سے امتِ مسلمہ کے اندر بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہو جائے، ان کے قلوب و اذہان پراگندہ ہو جائیں اور کسی ایک قرآنی نظریے پر بھی مسلمانوں کو کامل یکسوئی اور طمانیت قلب حاصل نہ ہو سکے۔ ان کی اس سعی نامشکور نے آج پوری دنیا میں اسلام کو ایک چیستاں بنا کے رکھ چھوڑا ہے۔

پاکستان کی مذہبی تاریخ میں جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی جناب مودودی مرحوم کا ایک خاص مقام ہے۔ انہوں نے جس طرح مختلف اوقات میں بعض معاملات کی مختلف شرعی تعبیرات کر کے بے یقینی کی فضا پھیلانے میں اپنا کردار ادا کیا وہ عام طور پر معلوم ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر کی نبوی اور بشری حیثیت کے بارے میں پہلے کہا کہ:

''قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، دراصل نبی بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے۔''

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۳۹ء)

لیکن اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ:

''قرآنِ کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان اور حیثیتِ امارت میں فرق کیا گیا ہو۔''

(تفہیمات، حصہ اول، ص ۲۴۱)

پہلے کہا کہ اسلام میں عورت کو سربراہی تو ایک طرف، ووٹ دینے کا حق بھی حاصل نہیں ہے مگر جب صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح اور ایوب خاں میں مقابلہ ہوا تو موصوف نے پورے لاؤ لشکر سمیت محترمہ کا ساتھ دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جہاد کشمیر کے خلاف فتویٰ دیا مگر جب عوامی ردِ عمل سامنے آیا تو فتویٰ کی تاویلات شروع کر دیں۔ اور آج یہی جماعت جہاد کشمیر کی سب سے بڑی داعی شمار ہوتی ہے۔ اس طرح کی لاتعداد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

جماعت کے انہی ''مرغِ بادنما'' اصولوں کے پیشِ نظر بہت سی شخصیات مختلف اوقات میں اس سے علیحدہ ہو گئیں جن میں پاکستان سے امین احسن اصلاحی' کوثر نیازی' عبدالغفار حسن' حکیم عبدالرحیم اشرف' عبدالجبار غازی اور نعیم صدیقی جبکہ بھارت سے منظور نعمانی اور وحید الدین خان وغیرہ شامل ہیں۔

اس جماعت کے تربیت یافتہ افراد خواہ انہیں جماعت سے خارج کیا گیا ہو یا وہ خود اسے چھوڑ چکے ہوں' امت مسلمہ میں بے یقینی کی فضا پھیلانے میں بڑے سرگرم واقع ہوئے ہیں۔ان میں سے دو شخصیات گذشتہ کئی سالوں سے بڑے طمطراق سے اپنی اپنی فکر کی ترویج و اشاعت میں مگن ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے ادارے تشکیل دے رکھے ہیں ور باقاعدگی سے ماہنامے بھی جاری کئے ہوئے ہیں۔ان میں سے پہلی شخصیت مہدی و دجال کی بابت اپنے مخصوص متضاد دعوؤں اور فلسفۂ انقلاب کے باعث کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ہماری مراد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ہے۔ان کی فکر پر تبصرہ اس وقت مقصود نہیں ہے۔ہم سردست اس شخصیت کی طرف آتے ہیں جس نے موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ میں انقلاب کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک جدید اور روشن خیال ''عالم دین'' کے طور پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ کوئی سانجی ٹی۔وی چینل کھول کر دیکھ لیں' کسی نہ کسی پر موصوف مصروفِ گفتگو ہوں گے۔ اندازِ بیاں بظاہر منطقی' لب و لہجہ سلجھا ہوا اور گفتگو میں روایتی ملائیت کا شائبہ تک نہیں۔ بات بات میں قرآنی آیات' سنت رسول' احادیث' جاہلی ادب اور ماہرینِ علم صرف و نحو سے استشہاد۔ ہماری مراد علامہ جاوید احمد صاحب الغامدی سے ہے۔ظاہر ہے کہ ایسے میں سطحیت پسند ناظرین کا متاثر ہو جانا لازمی امر ہے۔

لیکن اگر سطح سے نیچے اتر کر ذرا گہرائی میں جا کر موصوف کی کتب و رسائل کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کس طرح قرآن کے نقاب میں غیر قرآنی نظریات کی ترویج و اشاعت اور بے یقینی کی فضا پیدا کرنے میں منہمک ہیں۔کافی عرصہ جماعت میں گذار چکنے کے باوجود موصوف فکری طور پر حمید الدین فراہی' امین احسن اصلاحی اور وحید الدین خان سے بہت متاثر ہیں۔ خاص طور پر امین احسن اصلاحی کے ''تدبرِ قرآن'' کے آگے تو موصوف کی مژگانِ عقیدت جھک جھک جاتی ہیں۔

یوں تو غامدی صاحب نے اصول سے لے کر فروع' سیاست و معیشت سے لے کر دعوت و جہاد اور حدود و تعزیرات سے لے کر رسوم و آداب۔۔۔سب موضوعات پر اپنے بیش قدر نوادرات تخلیق فرمائے ہیں' مگر زیرِ نظر مضمون میں اہمیت کے لحاظ سے ان عنوانات پر بحث کی جا رہی ہے جو دین اسلام میں بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

نبی اور رسول میں تفریق: غامدی صاحب رقمطراز

ہیں:

''اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو خلق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرماتے ہیں اور اپنی طرف سے وحی والہام کے ذریعے ان کی راہنمائی کرتے ہیں انہیں نبی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر نبی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسالت ایک خاص منصب ہے جو نبیوں میں سے چند ہی کو حاصل ہوا ہے۔''

(میزان' طبع دوم' ص ۵۳)

ملت کے احبار و رہبان کے ہاں نبی اور رسول میں تفریق کا عقیدہ کوئی نیا نہیں ہے۔ یہی وہ چور دروازہ ہے جس سے شہ پا کر بعض لوگوں نے دعویٰ نبوت تک کا دعویٰ کر ڈالا تھا۔ غامدی صاحب کے ممدوح بہت عرصہ پہلے لکھ چکے ہیں کہ:

''متعدد انبیاء ایسے گذرے ہیں جن پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔ کتاب تو کبھی نبی کے بغیر نہیں آئی لیکن نبی کتاب کے بغیر بھی آئے ہیں۔''

(ترجمان القرآن' منصبِ رسالت نمبر ۱۹۶۱ وسنت کی آئینی حیثیت' ص ۹۷ ' طبع ۲۰۰۴ء)

لیکن غامدی صاحب نے بقیہ احبار و رہبان کی طرح ''نبی بلا کتاب'' کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے قرآن کی اس آیت پہ غور کیجئے کہ کس طرح یہ ''نبی بلا کتاب'' کے عقیدہ کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ ارشاد ہے: فبعث اللہ النبین مبشرین و منذرین (خدا نے انبیاء کو مبعوث فرمایا جو مبشر اور منذر تھے) و انزل معھم الکتاب (اور ان سب کے ساتھ کتابیں نازل کی گئیں)۔ (۲/۲۱۳)۔

بات واضح ہوگئی کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جو صاحبِ کتاب نہ تھا۔ نبی اور رسول کا فرق بتاتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ''نبوت'' کے ساتھ ''رسالت'' کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔ ''نبوت'' یہ ہے کہ بنی آدم میں سے کوئی شخص آسمان سے وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرے...... ''رسالت'' یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لئے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اس کی قوم اگر اسے جھٹلا دے تو اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اس پر قائم کر دے۔''

(میزان' طبع دوم ۲۰۰۲ء ص ۸۲)

گویا سادہ لفظوں میں ایک نبی کا کام خدا سے وحی پا کر لوگوں تک پہنچا دینا اور تبشیر و تنذیر کر دینا ہے۔ اس کے بعد نبیوں کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ موصوف کے اپنے

الفاظ میں:

''نبیوں کا انذار و بشارت تو کسی وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا لیکن رسولوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔''

(میزان' ص ۱۸۴)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے نبی اور رسول کی حقیقت قرآنی تعلیمات اور عربی لغت کی روشنی میں معلوم کی جائے۔ لفظ ''نبی'' کا ایک مادہ (ن۔ب۔أ) ہے جس کے معنی ہیں خبر دینا۔ اس لحاظ سے 'نبی' کے معنی ہوئے غیب کی خبریں دینے والا۔ پیش گوئیاں کرنے والا۔ کاہن۔ یہ تصور تورات کا عطا کردہ ہے۔ یہودیوں کے ہاں ''نبی'' ہیکل کے ایک منصب دار کو کہا جاتا تھا جس کا کام پیش گوئیاں کرنا یعنی کہانت ہوا کرتا تھا۔ اسی بنا پر نبی کو انگریزی میں (Prophet) کہا جاتا ہے یعنی 'پیش گوئیاں کرنے والا' اور نبوت کے معنی (Prophecy) لیے جاتے ہیں یعنی پیش گوئیاں کرنا۔ یہ تصور قرآن کے لئے سرتاسر اجنبی ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اکثر انبیاء نے اپنے بعد آنے والوں کی بشارت دی ہے مگر اس کی بنیاد وحی خداوندی ہوا کرتی تھی نہ کہ علمِ نجوم یا کہانت۔ قرآن کی رو سے نبی کا منصب پیش گوئیاں کرنا نہیں بلکہ وہ تو ایک عظیم انقلاب کا داعی ہوا کرتا تھا۔ لفظ ''نبی'' کا دوسرا مادہ (ن۔ب۔و) ہے جس کے معنی ہیں بلند ہونا۔ یعنی عام انسانوں کے مقابل نبی اس مقام بلند پر فائز ہوتا ہے جہاں سے اسے خدا کی طرف سے وحی عطا کی جاتی ہے۔ یہی نبی کا صحیح قرآنی تصور ہے۔ لہٰذا نبوت کے معنی ہوئے خدا سے وحی کا علم حاصل ہونا۔ نبی اس علم کو پا کر محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا تھا بلکہ اسے دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ اس کے اس فریضہ کو رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس جہت سے نبی اور رسول ایک ہی شخصیت کے دو پہلو' ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکے کے دو رخ ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ایک ہی فرد کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول۔ مثال کے طور پر نبی اکرمﷺ کو کہیں رسول کہا گیا ہے''محمد الرسول اللہ'' (۴۸/۲۹) اور کہیں نبی مثلاً ''یاایھا النبی حسبک اللہ'' (۸/۶۱) اور کہیں رسول اور نبی دونوں کہا گیا ہے جیسے ''فامنو باللہ و رسولہ النبی'' (۷/۱۵۸)۔ اس سلسلے میں سورہ نساء کی یہ آیات قابلِ غور ہیں:

ان اوحینا .... عزیزاً حکیماo (۴/۱۶۳-۱۶۵)۔

''(اے رسول) بے شک ہم نے تمہاری طرف بالکل اسی طرح وحی کی ہے جس طرح ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی اور نوح کے بعد دوسرے انبیاء

کی طرف وحی کی تھی اور جس طرح ہم نے ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ عیسیٰؑ ایوبؑ یونسؑ ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی تھی اور جیسے ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی تھی اور بھی بہت سے رسول ہیں جن کا تذکرہ ہم نے اس سے پہلے تم سے کیا ہے اور بہت سے رسول ایسے ہیں جن کا تذکرہ ہم نے تم سے نہیں کیا ہے اور خدا نے موسیٰ سے اچھی طرح کلام کیا تھا۔ یہ سب کے سب رسول تھے۔ جو بشیر و نذیر تھے تاکہ لوگوں پر رسول کے آ جانے کے بعد خدا کی کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اللہ بڑا عزیز و حکیم ہے۔'' (۶۵۔۱۶۳/۴)۔

مندرجہ بالا آیات بڑی جامعیت کے ساتھ بتا رہی ہیں کہ متذکرہ انبیاء کرام' اولادِ یعقوب کے انبیاء' اور وہ بہت سے جن کا ذکر حضرت محمد ﷺ سے کیا گیا اور وہ بھی جن کا ذکر نہیں کیا گیا' سب کے سب رسول تھے۔ انہی کو پہلے انبیاء کہا گیا ہے۔

سورۂ انعام میں محولہ بالا انبیائے کرام کے ساتھ ساتھ یوسفؑ' زکریاؑ' یحییٰؑ' الیاسؑ' الیسعؑ اور لوطؑ کا نام لے کر بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ان سب کو کتاب' حکم اور نبوت عطا فرمائی تھی۔ (۹۰۔۸۴/۶)۔ یہ دونوں مقامات اس مدعا کے اظہار کے لئے کافی و شافی ہیں کہ رسول اور نبی ایک ہی فرد ہوتا تھا جس کے دو الگ الگ منصب ہوتے تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص نبی تو ہو مگر رسول نہ ہو یا رسول تو ہو' نبی نہ ہو۔

غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ نبی تو انذار و بشارت دے کر خاموش ہو جاتا تھا مگر رسول انکار کی صورت میں اپنے مخاطبین کو عذاب کی وعید سناتا تھا۔ وہ ان پر اپنی حجت تمام کرتے ہوئے خود ہجرت و برأت کے مراحل طے کر کے وہ علاقہ چھوڑ جاتا ہے۔ اس دنیاوی عذاب کی' موصوف کے بقول دو شکلیں ہوتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑنے کے بعد یہ ذلت اس طرح مسلط کی جاتی ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں' ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا...... دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔''

(میزان' ص ۱۹۵)

قرآن کریم کی روشنی میں غور کیا جائے تو موصوف کا یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ طبعی حوادث مثلاً زلزلہ' آندھی' کڑک' آبی و بارانی طوفان کے ذریعے عذابِ خداوندی' قرآنِ کریم کی خاص اصطلاح ہے۔ اللہ نے اقوامِ نوحؑ و لوطؑ و عاد و ثمود و مدین وغیرہ کی مثالیں دے کر

بتایا ہے کہ کس طرح بعض سرکش و متمرد قوموں نے اپنے انبیاء کی نہ صرف تکذیب کی بلکہ ان کے درپئے آزار ہو گئے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون بعنوان ''طبیعی حوادث اور عذابِ خداوندی کا مروجہ تصور'' مطبوعہ ماہنامہ طلوع اسلام بابت جنوری ۲۰۰۶ء ملاحظہ کیجئے۔

قرآن میں پیش کی گئی چند مثالوں سے یہ کلیہ اخذ کرنا کہ ہر رسول لازماً عذاب ہی لے کر آتا تھا' فہمِ قرآن کا کوئی اچھا مظاہرہ نہیں ہے۔ ان مثالوں سے تو اللہ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ جس قوم پر بھی عذابِ خداوندی بذریعہ طبیعی حادثہ بھیجا گیا وہ کوئی بے خبری میں نہیں بھیجا گیا بلکہ پہلے وہاں رسول کو بھیجا گیا جس نے وہاں اللہ کا پیغام پہنچایا' لوگوں نے مخالفت اور انکار کیا' انہیں مہلت دی گئی اور پھر آخر میں انہیں طبعی حادثہ کے عذاب کے سپرد کر دیا گیا۔ اتمامِ حجت کے بغیر کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہر رسول اپنے ساتھ عذاب کا ''تحفہ'' لے کر ہی آتا تھا۔ رسولوں کی بعثت کا مقصد بتاتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنی قوموں کو بتاتے ہیں کہ وہ زمین پر ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دینے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔''

(میزان' ص ۱۸۵)

یہ موصوف کے اپنے دماغ کی ندرتِ پرواز ہو تو ہو' قرآن کی تعلیم ہرگز نہیں ہے۔ قرآن تو رسولوں کی بعثت کا مقصد یہ بتاتا ہے:

> وما ارسلنک من رسول الا یطاع باذن اللہ (۴/۶۴)۔
>
> ''ہم نے جو رسول بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

(ترجمہ از تذکیر القران ۔۔ وحیدالدین خاں)

یہاں پر دانستہ وحیدالدین خاں کا ترجمہ دیا گیا ہے جن سے غامدی صاحب حد درجہ متاثر ہیں۔ شاید انہی کی بات ان کی سمجھ میں آ جائے۔ اس کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ کی دنیا میں بعثت کا مقصد بتاتے ہوئے' قرآن کہتا ہے:

> وما ارسلنک الا رحمتہ للعالمین (۲۱/۱۰۷)۔
>
> ''اور اے نبی ہم نے نہیں بھیجا ہے تمہیں مگر دونوں جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔''

خوانندگانِ محترم! ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ قرآن کہہ رہا ہے کہ رسول رحمت ہوا کرتا ہے مگر صاحب موصوف کا فتویٰ ہے کہ رسول (معاذ اللہ) ''زحمت'' بن کر آتا ہے کیونکہ اسے ''قیامت صغریٰ'' بپا کرنا ہوتی ہے۔ دیکھ رہے ہیں آپ کہ مذہبی پیشوائیت قرآنِ کریم کو کس طرح

بازیچۂ اطفال بنا رہی ہے؟

ایک رسول کی دنیا میں آمد سے پہلے' غامدی صاحب کے بقول بہت سارے انبیاء اس کے متعلق بشارت پہ بشارت دیے چلے جاتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''ان سے پہلے آنے والا نبی ہی نہیں' نبیوں کی ایک پوری جماعت انسانوں پر اتمام حجت کے ساتھ ان کی منادی بھی کرتی ہے۔ وہ ان کے مولد وموطن اور احوال ووقائع' غرض ہر چیز کی خبر صاف الفاظ میں دیتی ہے۔ وہ خدا کی زمین سے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد رخصت ہوتی ہے تو اپنے ماننے والوں سے اس پیش گوئی کی حفاظت کا عہد لیتی ہے۔''

(مضمون بعنوان نبوت ورسالت' اشراق' جولائی ۱۹۹۴ء ص ۲۵)

موصوف نے اپنے ہی اخذ کردہ اصول یعنی رسول کی آمد کی بشارت انبیاء کے گروہ کی طرف سے دی جاتی ہے' کے علی الرغم' اپنے اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''نبیوں اور رسولوں کے اس مقدس سلسلہ کے خاتم نبی عربی ﷺ ہیں۔ آپ کی بعثت کی خبر حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت مسیح تک نبیوں ہی نہیں' جلیل القدر رسولوں نے بھی دی ہے۔''

(ایضاً' ص ۲۸)

کیا صرف رسول کی آمد کی بشارت ہی دی جایا کرتی تھی یا نبیوں کی آمد کی بشارت بھی ان سے پہلے آنے والے دیا کرتے تھے' اس سوال کا جواب موصوف یوں دیتے ہیں:

''نبیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے سے پہلے آنے والے نبی کی پیش گوئیوں کا مصداق بن کر آتے ہیں۔ قرآن مجید اور قدیم صحیفوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے۔''

(ایضاً' ص ۲۵)

محولہ بالا تینوں اقتباسات باہمدگر متضاد ہیں اور ان سے یہ حقیقت صاف جھلک کر نظر آ رہی ہے نبی اور رسول مرادف المعنی الفاظ ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ مگر موصوف نے اپنی ان تحریروں کے باعث اپنے قاری کو جس مخمصے میں لا کر چھوڑ دیا ہے' وہاں یہی فریاد کی جا سکتی ہے ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

قارئین اشراق میں سے ایک صاحب نے مورخہ ۲۳ جون ۱۹۸۶ء کو غامدی صاحب کو ایک خط تحریر کیا جس میں درج ذیل عبارت بھی تھی:

"'میزان' حصہ اول میں نبی اور رسول کے فرق کی

نوعیت پر آپ کے موقف کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ نبی کے معاملے میں تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ مخالفین کے ہاتھوں مارا جائے لیکن رسول کے معاملے میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ کی تحریر کردہ مثالوں سے بظاہر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی بنیاد پر بلا استثناء ایک غیر متبدل اصول تک رسائی محل نظر ہے اس لئے کہ قرآنِ حکیم ہی میں ہے کہ ''محمد نہیں مگر رسول۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گذر چکے ہیں۔ پس اگر محمد مر جائیں یا مارے جائیں تو تم لوگ اپنی پرانی حالت کی طرف پلٹ جاؤ گے............۔''

ناممکن قرار دادہ حقیقت کا بطور امکان تذکرہ بے معنی ہی ٹھہرے گا۔ امید ہے راہنمائی فرمائیں گے۔''

(بحوالہ ماہنامہ اشراق' اپریل ۲۰۰۰ء ص ۵۲۔۵۱)

سوال کے جواب میں یکم جولائی ۱۹۸۶ء کو غامدی صاحب نے تحریر فرمایا:

> ''رسولوں کے قتل کے بارے میں میرے مضمون پر آپ کا اعتراض قوی ہے۔ بعض دوسرے نصوص بھی اس معاملے میں بظاہر میری رائے کے خلاف ہیں۔ میں ان سب پر غور کر رہا ہوں' امید ہے جلد کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔ آپ براہِ کرم اس وقت تک انتظار کر لیں۔''

بحوالہ (ایضاً)

محترم قارئین' اس کے بعد ۱۹۹۴ء کے جولائی کے اشراق میں موصوف نے یہی بات پھر دہرائی۔ الفاظ یہ تھے۔

> ''نبیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی تکذیب ہی نہیں کرتی' بارہا ان کے قتل کے درپے ہو جاتی ہے۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے.........لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے معاملے میں اللہ کا قانون مختلف ہے۔''

(ماہنامہ اشراق' جولائی ۱۹۹۴ء' ص ۳۱)

یعنی آٹھ سال کے ''غور'' کے بعد بھی موصوف کسی نتیجے پر نہیں پہنچے بلکہ سابقہ موقف پر ہی قائم رہے' درآں حالیکہ قرآنِ کریم کے بعض دوسرے نصوص بھی ''بظاہر'' غامدی صاحب کی رائے کے خلاف تھے۔ دیکھ لیجئے ایک طرف ان حضرات کی اپنی رائے ہوتی ہے اور دوسری جانب قرآنی نصوص' پھر بھی ان کا پندارِ نفس فہم قرآن کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ سال ۲۰۰۰ء کے اپریل میں ماہنامہ اشراق میں ۱۴ سال پرانی خط و کتابت بلاتبصرہ شائع کرنا اس امر پر دال ہے کہ موصوف ابھی تک غور و فکر کی منزل سے گذر رہے ہیں اور مستفسر کو اپنا جواب پانے کے لئے شاید عمرِ خضر درکار ہو۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ موصوف کی کتاب ''میزان'' کے ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں ان کا مضمون 'نبوت و رسالت' شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا ہو۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہے۔ آج بھی اسی عقیدہ کا پرچار اپنے مضامین میں کرتے ہیں کہ نبی قتل ہوسکتا ہے مگر رسول قتل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے اگرچہ اب وہ ذرا محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''نبی' ہوسکتا ہے کہ اپنی قوم کے مقابلے میں ناکام ہوجائے' لیکن رسول بہرحال اپنی قوم پر غالب آتا ہے۔''

(''برہان'' ص ۱۴۸' ایڈیشن چہارم ۲۰۰۶ء)

یعنی ۲۰ سال کے غور و فکر کے بعد بھی 'پرنالہ' اپنی جگہ پر قائم ہے۔ موصوف کے اسی طرح کے رویے کو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ''ضدم ضدا'' سے تعبیر کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ اشراق فروری ۱۹۹۳ء صفحہ ۲۳۔ ہم اتنی جسارت تو نہیں کرسکتے مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ ؎

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی آستاں ہے وہی سنگِ در ہے

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ قرآن کے ان مقامات کو دیکھ لیا جائے جہاں بتایا گیا ہے بنی اسرائیل انبیاء کو قتل کر دیا کرتے تھے (۲/۶۱' ۳/۲۱' ۲/۹۱' ۳/۱۱۲' ۴/۱۱۵)۔ دوسرے مقام پر ہے کہ وہ رسولوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

> قل قد جاء کم رسل من قبلی بالبینٰت و بالذی قلتم فلم قتلتموھم ان کنتم صدقین (۳/۱۸۳)۔
>
> ''اے رسولؐ ان سے کہو مجھ سے پہلے تمہارے پاس رسول آئے واضح نشانیاں لے کر اور وہ چیز لے کر جس کو تم کہہ رہے ہو' پھر اگر تم سچے ہو تو کیوں تم نے ان کو قتل کر ڈالا؟''
>
> (۱۸۲/۳اور ۲/۸۷' ۵/۷۰)۔

قرآنِ کریم نے چونکہ رسول اور نبی کے الفاظ مرادف المعنی کے طور پر استعمال کیے ہیں اس لیے کہیں نبی کہا گیا ہے کہیں رسول۔ قرآن کی ان نصوصِ صریحہ کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اپنے طبع زاد عقیدے پہ جما رہے' تو اس کے لئے کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ ؎

چوں نہ بینند حقیقت' رہ افسانہ زدند

حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔ موصوف نے قتلِ انبیاء کی جو مثالیں دی ہیں بڑی دلچسپ ہیں' فرماتے ہیں:

> ''چنانچہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے عام داعی تو ایک طرف' یہ مرحلہ ان نبیوں کی دعوت

میں بھی نہیں آیا جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت ملی لیکن وہ رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوئے۔ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے حنانی اور میکایاہ جیل بھیج دیے گئے (تواریخ ۱۰۔۷/۱۷) الیاس کو جزیرہ نمائے سینا میں پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی (سلاطین ۱۰۔۱/۱۹) زکریا ہیکل سلیمانی میں ''مقدس'' اور ''قربان گاہ'' کے درمیان سنگسار ہوئے (تواریخ ۲۱/۲۴) یرمیاہ پیٹے گئے قید ہوئے اور رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے (یرمیاہ ۱۰/ ۱۵) عاموس جلا وطن ہوئے (عاموس ۱۳۔۱۰/۷) اور یحییٰ کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا گیا (مرقس ۲۹۔۱۷/۶) لیکن ان میں سے کسی کی دعوت میں بھی ہجرت و برأت کا وہ مرحلہ نہیں آیا جو ان نبیوں کی دعوت میں لازماً آیا جو رسالت کے منصب پر فائز ہوئے۔'' (برہان طبع چہارم ۲۰۰۶ء ص ۹۴۔۲۹۳ و اشراق جولائی ۱۹۹۴ء ص ۳۱)۔

غامدی صاحب نے اپنے موقف کے حق میں فرمایا ہے کہ ''قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے'' مگر جب وہ مثالیں دینے لگے تو قرآن کریم سے انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ناچار ساری مثالیں انہیں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید سے دینی پڑیں یہ قرآن کے منہ میں اپنی بات ڈالنے کی ایک بھدی سی مثال ہے۔ ان مثالوں میں ذکر کیے گئے 'الیاس' اگر وہی ہیں جن کا نام قرآنِ کریم میں ہے تو بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قرآن سے غامدی صاحب کے دعویٰ کی تائید نہیں تردید ہوتی ہے۔ موصوف نے انہیں اپنے عقیدے کے مطابق نبیوں میں جگہ دی ہے جبکہ قرآن انہیں زمرۂ مرسلین یعنی رسولوں میں جگہ دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو: وان الیاس لمن المرسلین (اور بلاشبہ الیاس خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے تھا) (۳۷/۱۲۳)۔

سچی بات یہ ہے کہ باطل قرآن میں' دائیں' بائیں' اوپر یا نیچے' کہیں سے بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خالقِ کائنات نے اٹھا رکھی ہے۔ ذرا تصور کیجئے اگر کہیں خدا نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا ہوتا تو ہماری مذہبی پیشوائیت اس کا کیا حال کرتی۔

اس بے بسی میں ذوقؔ یہ عالم بشر کا ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

اب ہم اس بنیادی آیت کی طرف آتے ہیں جہاں سے دیگر احبار و رہبان کی طرح موصوف کو بھی ٹھوکر لگی ہے۔ اپنے مضمون ''نبوت و رسالت'' میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''نبوت و رسالت کے الفاظ قرآن مجید میں

مترادف حیثیت سے بھی آئے ہیں لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو الگ الگ اصطلاحات بھی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته (الحج۔ ۲۲۔ ۵۲)۔

''اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا ہے تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا' شیطان اس کے ارمان میں خلل انداز ہو گیا۔''

یہ الفاظ صریح ہیں کہ نبی اور رسول دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔''

(اشراق' جولائی ۱۹۹۴ء' ص ۲۴)

قارئین محترم! سورۂ حج کی محولہ بالا مکمل آیت' اس کا ترجمہ اور مفہوم اس طرح سے ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته۔ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیته۔ واللہ علیم حکیم o (۲۲/۵۲)۔

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ جب اس نے اپنی وحی کی تلاوت کی (اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا) تو شیطان نے اس تلاوت کردہ وحی میں اپنی طرف سے کچھ نہ ملا دیا ہو............۔''

یعنے ہر رسول کے ساتھ یہی ہوا کہ وہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا کر چلا جاتا لیکن اس کے بعد مفاد پرست گروہ اس وحی میں اپنے خیالات کی ملاوٹ کر دیتے تھے۔ مگر خدا ایسا انتظام کر دیتا تھا کہ اس کے بعد پھر ایک اور رسول بھیج کر سابقہ وحی میں کی گئی ملاوٹ سے اس وحی کو پاک کر کے خدا کی سچی اور کھری تعلیم کو پھر سے اپنے معاشرے میں عام کر دیتا تھا۔ یہ کچھ ہوتا رہا تا آں کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ پر نازل شدہ وحی قرآن کریم میں محفوظ کر دی گئی اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس آیت میں یہ جو کہا گیا ہے۔

''من رسول ولا من نبی''

اس سے ہمارے احبارِ کرام اور رہبانِ عظام یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ رسول اور نبی الگ الگ شخصیات ہوا کرتی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے قرآن ہی کی دی گئی چند ہدایات کو سامنے رکھنا ہو گا۔ اس نے کہا کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے (۴/۸۲)۔ یہ تو غامدی صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ نبی اور رسول قرآن میں مترادف معنوں میں ''بھی'' استعمال ہوئے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کی لاتعداد

آیات ایسی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کو کتاب، نبوت اور حکم عطا کیا جاتا ہے۔ ماضی میں دونوں کو قتل کیا جاتا رہا ہے۔ اب اگر اس آیت (۲۲/۵۲) سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی اور رسول الگ الگ منصب ہوتے ہیں تو اس سے قرآن کی آیات میں بہت عظیم اصولی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل قرار پاتا ہے۔ اس لئے ہماری بصیرت کی رو سے اس آیت کا مفہوم درست نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ یہ ایک ہی بات کو اس کی اہمیت کے پیش نظر مختلف زاویوں سے بار بار بیان کرتا ہے، اسے وہ ''تصریفِ آیات'' کہہ کر پکارتا ہے۔ گویا بقول میرانیس ؎

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

قرآن نے جب کسی حقیقت کو حصر کے ساتھ بیان کرنا ہو (یعنی خاص اہمیت کے پیشِ نظر اس کے تمام گوشوں کا احاطہ مقصود ہو) تو وہ اس کے لئے ان مختلف الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ لے آتا ہے جو اس حقیقت کے لئے قرآن کے مختلف مقامات میں آئے ہوں۔ مثال کے طور پر۔۔۔ قرآن نے اپنے آپ کو عام طور پر ''قرآن'' ہی کہا ہے۔ مگر کہیں ''کتاب'' کہا ہے اور کہیں ''ذکر'' بھی کہا ہے۔ اب قرآن میں ایسی بھی آیات ہیں جن میں یہ الفاظ ساتھ ساتھ بھی آئے ہیں۔ مثلاً

ان ھو الاذکر و قران مبین (۳۶/۶۹) نیا جیسے سورہ حجر میں ارشاد ہے: تلک ایت الکتاب و قران مبین (۱۵/۱)۔

ان اور ان جیسی دیگر آیات میں اگر (و) کا مطلب موصوف کی طرح (اور) کیا جائے تو پہلی آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ ''یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ذکر ہے اور قرآن مبین ہے۔'' اور دوسری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ ''یہ کتاب کی آیات ہیں اور قرآن مبین کی۔'' اور اس طرح کے ترجمے سے ذکر اور قرآن یا کتاب اور قرآن دو الگ الگ چیزیں متصور ہوں گی جو کہ بالبداہت غلط ہے اور جسے سمجھنے کے لئے کسی آئن سٹائن کے دماغ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن ہی ذکر بھی ہے اور کتاب بھی۔ ایسے مقامات میں (و) تفسیری ہوا کرتا ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے (یعنی)۔ اس سے ان آیات کا ترجمہ یہ ہوگا۔ ''یہ ذکر ہے یعنی قرآنِ مبین'' اور ''یہ کتاب یعنی قرآنِ مبین کی آیات ہیں''۔ اس سے محض وضاحت مقصود ہوا کرتی ہے۔

بعض اوقات اہمیت کے پیشِ نظر بھی قرآن میں یہی انداز بیاں اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

من کان عدوا للہ و ملئکتہ و رسلہ

جبرائیل و میکائیل ...... (۲/۹۸)۔

''جو اللہ' ملائکہ اور رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے۔''

یہاں پہلے ملائکہ کہا گیا ہے پھر جبریل اور میکائیل کا نام لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جبریل اور میکائیل' ملائکہ کے اندر ہی شامل ہیں۔ ملائکہ کہہ دینے کے بعد ان کا الگ الگ ذکر کر دینے سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ملائکہ سے الگ کوئی گروہ ہے۔ مقصد صرف اہمیت کو نمایاں کرنا ہے۔ اسی طرح (۴/ ٦٦) میں ''ملائکہ'' کہنے کے بعد ''وجبریل'' بھی کہا گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک اور مثال سورۂ احزاب میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

و اذا اخذنا من النبین میثاقھم و منک ومن نوح و ابراھیم و موسیٰ و عیسی ابن مریم .... (۳۳/۷)۔

پہلے کہا کہ ''جب ہم نے انبیاء سے عہد لیا۔'' ظاہر ہے کہ ''انبیاء'' میں تمام نبی شامل ہیں۔ اس کے بعد ہے 'ومنک' (اے مخاطب! یعنی نبی اکرم ﷺ) تجھ سے بھی''۔ اس سے بظاہر یوں نظر آئے گا جیسے یہ مخاطب زمرۂ انبیاء کرام میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ ان سے الگ کچھ اور ہے۔ اس کے بعد ہے 'ومن نوح ......' ''اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ سے بھی''۔ یعنی یہ حضرات نہ تو ''زمرۂ انبیاء میں شامل ہیں اور نہ ہی اس گروہ میں جو مخاطب (منک) سے علاقہ رکھتا ہے۔ اس طرح اس پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔

''اور جب ہم نے انبیاء سے عہد لیا' اور تجھ سے بھی' اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ سے بھی ......۔''

بات توجہ طلب ہے۔ کیا اس سے یہ مان لیا جائے کہ نبی اکرم ﷺ' حضرت نوحؑ' ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (علیہم السلام) زمرۂ انبیاء میں شامل نہیں بلکہ ان سے الگ کچھ اور ہیں؟ مگر ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ زمرۂ انبیاء میں شامل ہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے کہ قرآن کا یہ ایک مخصوص اسلوب ہے کہ وہ ایک ہی گروہ کے مختلف افراد یا ایک کل کے مختلف اجزاء کا ذکر الگ الگ بھی کرتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ افراد اس گروہ سے یا وہ اجزاء اس کل سے الگ اور مختلف ہیں۔ لہٰذا سورۂ حج کی آیت نمبر ۵۲ میں جو رسول اور نبی کے الگ الگ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس سے یہ مقصد نہیں کہ نبی اور رسول الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس سے حصر یا اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ کہ نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے۔۔۔ قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ نبی اور رسول ایک ہی فرد ہوتا تھا' اس کا خدا سے وحی پانا' نبوت تھا اور اس وحی کو آگے پہنچانا رسالت۔

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

دین میں اطاعت کا مرجع زندہ اتھارٹی ہوتی ہے

جس دور میں قرآن کریم نازل ہوا، ساری انسانیت میں دین کا تصور دور دور تک کسی جگہ بھی نہیں تھا۔ ہر جگہ ''مذہب'' کا دور دورہ تھا۔ قرآن کریم وہ باعظمت کتاب ہے کہ جس نے اس دور کی انسانیت کو ''دین'' کے تصور سے روشناس کرایا۔ مذہب کا مقصد صرف خدا کی پرستش (Worship) ہوتا ہے جو کسی بھی عبادت گاہ میں کی جا سکتی ہے۔ مذہب اللہ تعالیٰ اور انسان کے مابین ذاتی، نجی، پرسنل تعلق کا نام ہے۔ اس کو انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب میں ہر شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت اپنے اپنے طریقہ اور اپنے اپنے انداز سے کر سکتا ہے۔ لیکن دین کا تصور اس سے سراسر مختلف ہوتا ہے۔ اس تصور کے مطابق دین انسان کی ساری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ اس میں خدا کی اطاعت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر اختلافات ہوں، ان سب کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی ایسی زندہ اتھارٹی موجود ہو جہاں سے تمام امور کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کی رو سے کرایا جا سکتا ہو۔ اس کے لئے کسی حاکم، مقتدر اتھارٹی کی ضرورت لازمی ہے۔ مذہب میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت انفرادی طور پر ہو سکتی ہے لیکن دین میں اللہ کی اطاعت صرف اجتماعی طور پر ہو سکتی ہے۔ اسی لئے مذہب میں تو اطاعت کے لئے صرف قوانین یا خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے، لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ایک زندہ، مرئی (Visible) شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت خود بھی کرتی ہے اور دوسروں سے بھی اس کی اطاعت کراتی ہے۔ یہ شخصیت اللہ کا رسول ہوتی تھی کیونکہ اسی کو وہ کتاب ملتی تھی اور اسی کے ذریعے اس کتاب کا نظام قائم ہوتا تھا۔ خود قرآن کریم نے اس طریقہ کو بیان بھی فرمایا ہے کہ مومنین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے احکامات سنتے ہیں اور پھر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

وقالوا سمعنا واطعنا (۲/۲۸۵)۔

ان کی عملی زندگی کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ انہیں زندہ اتھارٹی سے جو حکم ملتا ہے اسے وہ دل کے کانوں سے سنتے ہیں اور دل کی گہرائیوں سے ان پر عمل کرتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ و انتم تسمعون (۲۰/۸)۔

تم اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس کے احکام کو سن کر ان سے کبھی انحراف نہ کرو۔

یہاں بھی پہلے احکامات کو سننا شرط ہے پھر اس پر عمل پیرا ہونا ہوتا ہے۔ نیز ارشاد ہوتا ہے۔

فا تقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا و انفقوا خیرا لا نفسکم (۱۶/۶۴)۔

تو جہاں تک تم سے ہو سکے خدا سے ڈرتے رہو' اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔

یہاں بھی حکم پہلے احکامات کو سننے اور پھر ان پر عمل کرنے کا ہے۔ نیز یہاں تقویٰ کو 'سماعت' ۔ 'اطاعت' اور 'انفاق' سے Define کیا ہے کہ تقویٰ سے مراد 'سماعت'۔ 'اطاعت' اور 'انفاق' ہے۔ سب میں پہلا درجہ 'سماعت' کا ہے اصرار و تشدید اس بات پر ہے کہ احکامات زندہ حاکم جاری کر رہا ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

و کیف تکفرون و انتم تتلیٰ علیکم ایت اللہ و فیکم رسولہ و من یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم (۱۰۱/۳)۔

اے جماعت مومنین تم کس طرح کفر کی راہ اختیار کر سکتے ہو اس لئے کہ ایمان کے راستے پر جمے رہنے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ قوانین خداوندی انسان کے سامنے ہوں اور دوسرے یہ کہ ان قوانین پر عملی طور پر چلانے کے لئے' ایک زندہ اتھارٹی موجود ہو اور یہ دونوں چیزیں تم میں موجود ہیں۔

حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین اپنی زندگی کے دوران ہی ہزاروں ہزار کوششیں کر کے' مدینہ منورہ میں عملاً متشکل کر کے دکھا دیا۔ نظام کو عملاً متشکل کرنے میں حضور ﷺ کے ساتھ ساتھ ان کے چاند سے زیادہ روشن' اور سورج سے زیادہ درخشندہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین نے بھی بیش از بیش قربانیاں سرانجام دیں۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ یہ نظام صرف حضور ﷺ کی زندگی کے دورانیہ کے لئے ہی قائم کیا گیا ہو۔ یہ بات عقلاً محال ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں وفیکم

رسولؐ سے مراد صرف حضورؐ کی شخصیت یا حضورؐ کی ذاتِ مبارک نہیں ہے بلکہ اس فیکم رسولؐ میں حضورؐ کی ذات کے علاوہ حضورؐ کے جانشین اور خلفاء بھی شامل ہیں۔ حضور کے بعد حضورؐ کے خلفاء کو وہ ہی مقام حاصل ہے جو اس نظام میں حضور کا اپنا مقام تھا جس طرح اپنے دور میں حضور بحیثیت ایک زندہ اتھارٹی کے موجود تھے ان کے بعد ان کے خلفاء اس نظام میں بحیثیت زندہ اتھارٹی موجود ہوں گے اور ان کی سربراہی میں ہی وہ نظام آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ فلہٰذا جب تک تم میں قرآن اور قرآنی نظام چلانے والا باقی رہے گا تم گمراہ نہیں ہو گے۔ اسی طرح اعتصام باللہ سے عملاً مراد نظام خداوندی سے وابستہ رہنا ہے فرداً فرداً اللہ تعالیٰ کی عبادت اس سے مراد نہیں ہے۔ وفیکم رسولؐ کا یہ قرآنی مفہوم سمجھ لینے سے قرآن فہمی میں جو بے شمار الجھنیں اور اشکال چلی آ رہی ہیں وہ خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔

جب تک قرآن کریم کا نظام قائم رہا رسول کا یہ مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے حکم الٰہی کی پیروی کرنے میں کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی لیکن جب وہ نظام ہی منقرض ہو گیا اور یہ نظام ملوکیت میں تبدیل ہو گیا تو رسول کا یہ صحیح مفہوم اذہان سے محو ہو گیا اور اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کی عملی شکل اختیار کرنے میں سخت دشواری کا سامنا پیش آیا اور اس کے مختلف مفہوم اخذ کئے جانے لگے اور اس کا حل یہ سوچا گیا کہ اللہ کی اطاعت تو قرآن سے کر لی جائے اور رسول کی اطاعت احادیث کے ذریعے کر لی جائے اور عملاً رسول کا ترجمہ احادیث قرار دے دیا گیا لیکن خلافت راشدہ کے دور میں رسول اللہ کی احادیث کا کوئی مجموعہ موجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس وقت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کا قرآنی مفہوم ان کے سامنے تھا یعنی نظام خداوندی قائم تھا جس میں اس نظام کی اطاعت' خدا ورسول کی اطاعت کے قائم مقام تھی یعنی قرآن کریم کی اطاعت نظام اسلامی کے ذریعے۔

قرآن کریم ایک نظام' ایک ضابطۂ حیات کو عملاً جاری کرنے کا داعی اور متقاضی ہے۔ ماضی میں اس کے اس تقاضے کو اس درجہ محسوس نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے حیات چل رہے تھے اور انسانیت ان سے اگرچہ پوری طرح مطمئن نہیں تھی' تاہم ان سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھی۔ آج صورت حالات بالکل مختلف ہے کمیونزم ہماری نگاہوں کے سامنے ناکام ہوا۔ جمہوری ممالک جس باطنی اضطراب میں مبتلا ہیں' ہمیں تو اس کا اگرچہ صحیح احساس نہیں ہے لیکن وہاں کے مفکرین اس پر واویلا مچا رہے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی تہذیب کا زوال دیکھ رہے ہیں۔ خود مسلمان بھی زوال اور تباہی کے

آخری درک پر کھڑے ہوئے ہیں۔مسلمان اپنی تباہی کی وجہ سے پھر قرآن کے قریب آ رہے ہیں اور اس کو ضابطہ حیات کے طور پر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔لیکن سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام' بغیر کسی استثناء کے قرآن کریم کو بحیثیت دین کے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔اور اس کی وجہ بالکل ظاہر و باہر ہے۔ان کو جو قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے وہ بحیثیت ''مذہب'' کے دی جاتی ہے۔ہمارا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر قرآن کریم کو بحیثیت مذہب کے پیش کرتا ہے اور ہمارے علماء کرام اور فقہائے عظام کو وہ ہی لٹریچر پڑھایا جاتا ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ ان کے سامنے قرآن بحیثیت مذہب کے ہی آتا ہے۔اگرچہ زبانی دعویٰ ان کا دین کا ہی ہوتا ہے' لیکن ان کے سارے نظریات قرآن بحیثیت مذہب کے ہوتے ہیں۔ البتہ ہمارے ہاں وہ طبقہ جو ان دانشوروں اور مفکرین پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کا ازخود مطالعہ کر رہے ہیں اور علمائے کرام کے مقرر کردہ نصاب سے زیادہ متاثر بھی معلوم نہیں ہوتے۔ان کے سامنے قرآن بحیثیت دین کے آتا تو ہے لیکن سابقہ نظریات سے وہ بھی سرمو انحراف نہیں کرتے۔اس نکتہ کی وضاحت رسول اللہ کی اطاعت کا عملی طریقہ متعین کرنے سے ہو جاتی ہے۔ یا باندازِ دیگر دین میں اور مذہب میں حدیث کے مقام میں جو فرق ہے اس کو نمایاں کرنے سے ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس نکتہ میں ندرت اور نکارت ہے۔اس لئے اس کے مفہوم کی تجدید کی جاتی ہے تا کہ یہ نکتہ دین میں مستقلاً محفوظ رہے۔

مذہب میں اللہ تعالیٰ اور انسان کا براہ راست تعلق ہوتا ہے جسے عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا لیکن دین میں اللہ کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر تنازعات اور جھگڑے پیدا ہوں' ان کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جاتا ہے۔جس کے لئے ایک حکومت کا قیام لازمی وضروری ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مذہب میں ہر شخص اللہ کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے لیکن دین میں خدا کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔ مذہب میں اطاعت کے لئے صرف قوانین کافی ہوتے ہیں لیکن دین میں اطاعت کے لئے ایک زندہ شخصیت ضروری ہوتی ہے۔ جس کے احکامات سن کر ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ مذہب میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے قرآن وحدیث کی اطاعت کافی ہوتی ہے لیکن دین میں یہ کافی نہیں ہے' اس کے لئے مرکزی اتھارٹی لازمی چیز ہے۔اس کی وضاحت زیرغور آیہ کریمہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد حضرت باری عز اِسمہ ہے۔

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم' فان تنازعتم فی شئی

فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر و احسن تاویلا (۴/۵۹)۔

اے ایمان والوں اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی' اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تم کسی چیز میں تنازعہ کرو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اچھا اور متوازن طریقہ ہے۔

یہ آیت کریمہ بہت مشہور آیت ہے اور خصوصاً ہمارے دو فرقوں کے علمائے کرام کے لئے مناظرہ کا بہت دلچسپ عنوان ہے اور تیرہ سو سال سے مناظرے اور مجادلے کے باوجود اب تک مختلف فیہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس آیت کریمہ کو درست طور پر سمجھنے سے ہی دین اور مذہب کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس درجہ جامع ہے کہ اس ایک ہی آیت میں اسلامی نظام کا پورا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے' ''اطاعت اللہ و رسول'' یہ قرآن کریم کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور اس سے مراد اس نظام خداوندی کی اطاعت ہے جسے سب سے پہلے حضور ﷺ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس نظام میں تمام جھگڑے حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ لیکن دور دراز کے مقامات کے سارے تنازعات ظاہر ہے کہ وہ حضور ﷺ کے سامنے نہیں آ سکتے تھے وہ حکومت کے مقامی حکام' صاحبانِ امر کے سامنے پیش ہوتے تھے اور صاحبانِ امر ان کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان مقامی حکام کی اطاعت' مرکزی حکومت یا دوسرے الفاظ میں رسول اللہ کی اطاعت ہوتی تھی۔ لیکن یہ فرق ضرور تھا کہ مقامی حکام کے فیصلوں کے خلاف' مرکز میں اپیل ہو سکتی تھی کیونکہ اس بات کی اجازت تھی کہ فان تنازعتم فی شئی فردوہ' الی اللہ و الرسول۔ اگر تم میں اور **اولی الامر** (مقامی افسران) میں کوئی اختلاف ہو تو اس کو مرکز کی طرف لوٹا دو' وہاں سے جو فیصلہ ہو وہ حتمی فیصلہ ہو گا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نظام صرف حضور ﷺ کی زندگی تک کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کو آئندہ بھی چلنا تھا۔ سوال یہ ہے کہ حضور کے بعد تنازعات کا فیصلہ کس طرح کرایا جائے۔ یا دوسرے الفاظ میں **''رد الی اللہ و الرسول''** کا عملی طریقہ کیا ہے۔ ہمارے علمائے کرام کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ''جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے اور اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے آداب و شرائط جو نبی ﷺ کی تعلیم اور صحابہؓ کے تعامل سے معلوم ہوئے ہیں وہ اصول فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ایسے فطری اور عقلی ہیں کہ کسی معقول آدمی

کے لئے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے''۔ نیز تحریر فرمایا گیا ہے کہ ''ظاہر ہے کہ حضور کی وفات کے بعد آپ کی سنت ہی ہے جو آپ کے قائم مقام ہوسکتی ہے''۔ (مشہور و معروف تفسیر تدبر قرآن' جلد دوم' ص ۳۲۶)۔ یہ مذہب کی ترجمانی ہے' اور سب کا اس پر تیرہ سو سال سے اجماع ہے اور اس طرح اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ دین کا نقطہ نگاہ نہیں ہے کیونکہ کتابوں کی از خود اطاعت کرنا مذہب میں تو ممکن ہے دین میں ممکن نہیں ہے۔ دین میں جب کتاب اللہ کی اطاعت کرائی جاتی ہے تو اس کے لئے ایک محسوس شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

آگے چلنے سے پیشتر قارئین کرام سے ایک سوال نہایت عاجزی اور فروتنی سے کیا جاتا ہے۔''رد الی اللہ والرسول'' کے طریقہ کو قرآن کریم نے خیر و احسن تاویلا کہا ہے۔ آپ اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر نہایت دیانتداری سے ارشاد فرمائیں کہ کیا اس تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا کوئی تنازعہ بھی اس طرح کے ''رد الی اللہ و الرسول'' سے طے پایا ہے۔ اندازہ تو یہ ہے کہ اس عرصۂ دراز میں مسلمانوں میں ہزاروں تنازعات پیدا ہوئے ہوں گے' لیکن ایک تنازعہ بھی اس طریقہ رد الی اللہ و الرسول سے کبھی بھی طے نہیں پایا بلکہ ماشاء اللہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے تو پھر یہ طریقہ کیسے خیر و احسن تاویلا ہوسکتا ہے اور امور تو ایک طرف خود اس آیہ کریمہ کا ہی کوئی متفق علیہ مفہوم اس طریقہ کے ماتحت واضح نہیں ہوسکا اور آج تک امتِ مسلمہ کے دو فرقوں میں اس آیت کے درست مفہوم میں اتفاق نہیں ہوسکا ہے اور نہ ہی کبھی آئندہ ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم کو بحیثیت دین سامنے رکھئے تو آیت کریمہ کا مفہوم خود بخود واضح ہے۔

اے ایمان والو اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے رسول اللہ نے قائم کیا ہے اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگانِ حکومت (افسرانِ ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم میں اور ان ماتحت افسران میں کسی بات میں تنازعہ پیش آ جائے تو اس کے مرکز کی طرف رجوع کرو۔ یعنی مقامی حکام کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو جو اس تنازعہ کا قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی۔ مرکزی اتھارٹی کے فیصلے کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ اس کا فیصلہ حتمی' آخری اور فائنل ہوگا اور چونکہ وہ فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہو گا' جس پر تم ایمان رکھتے ہو' اس لئے اس فیصلہ کو بخوشی تسلیم کرو اور یہ روش نہایت عمدہ اور معاشرہ کا توازن رکھنے والی ہوگی۔

فان تنازعتم فی شئی میں ان تمام متنازعہ امور کا تذکرہ ہے جو مرکز کی طرف سے مقرر کردہ

عمال کے خلاف عوام میں پیدا ہوں گے۔ خواہ عدلیہ' انتظامیہ' پانی' زراعت' صنعت' ریل' ڈاک' ریونیو' ٹیکسیز' کسی بھی محکمہ کے خلاف ہوں۔ ان کے ازالہ کے لئے مرکز ہی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت کریمہ سے سابقہ آیت نمبر ۵۸ میں ان تؤدوا الامنت الی اھلھا و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل کے الفاظ میں مرکزی اتھارٹی کو تاکید کر دی گئی ہے کہ رشوت خور' بے ایمان' نااہل عمال عوام کے حکام نہ بننے پائیں اور نہ ہی نااہل افسران قاضی' جج' وغیرہ عہدوں پر متعین کئے جائیں۔

اس تاکید کے بعد آیت زیرغور نمبر ۵۹ میں عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی سرکاری عاملوں' افسران اور قاضیوں کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہو' تو وہ مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اس مرکزی اتھارٹی کو ہر کسی کی شکایت بروقت سننے اور اس کا ازالہ کرنے کا حق ہو گا اور پھر ہر شخص کو اس فیصلہ کی اطاعت کرنی ضروری ہوگی۔ کیونکہ یہ اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس قرآنی مرکز کی سب سے پہلی اتھارٹی رسول اللہ ﷺ خود تھے اور آپ کے بعد' آپ کے عالی مرتبہ' عالی مقام خلفاء کرامؓ یکے بعد دیگرے' اس مرکزی اتھارٹی کے حامل تھے۔

واضح رہے کہ محدثین کی جمع کردہ ظنی و مشکوک موضوع روایات پر عمل کرنے سے اللہ و رسول کی اطاعت ہرگز ہرگز نہیں ہوتی بلکہ قرآنی اسلامی حکومت کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اسی لئے اس حکومت کا قیام از بسکہ ضروری' لازمی اور لابدی ہوتا ہے اسی لئے مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد' مکمل' اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو' وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی' نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں اور خواہ کتنی ہی نعتیں رو رو

کر پڑھتے ہوں' وہ خود بھی دھوکے میں مبتلاء ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطہ دے رہے ہیں۔

کیونکہ قرآن کریم کی رو سے اللہ و رسول کی اطاعت اسلامی نظام سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا قائم کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ اس موضوع پر رسالہ طلوع اسلام میں اس قدر مواد فراہم کر دیا گیا ہے کہ اس کا یہاں بار بار اعادہ کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اگر کسی صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو راقم سطور کے مضامین سابقہ اشاعتوں میں ملاحظہ فرما لیں۔ البتہ یہاں صرف دو آیات اس مضمون کی درج کی جاتی ہیں۔ جن میں ان لوگوں کو سرزنش اور تنبیہہ کی جاتی ہے جو اسلامی نظام کے قیام کی کوشش نہیں کرتے اور جو غیر خداوندی نظام میں زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ان الذین توفھم الملئکة ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا لم تکن ارض اللہ واسعة فتھا جروا فیھا فاولئک ماوٰھم جھنم وساء ت مصیرا (۴/۹۷)۔

وہ لوگ جو غیر خداوندی نظام کے تحت اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں اور اس طرح (طاغوت) کی اطاعت سے) اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں اگر اس حالت میں ان کو موت آ جائے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم غیر خداوندی نظام کی محکومی میں پڑے رہے۔ وہ کہیں گے کہ ہم پست' کمزور و ناتواں اور بے بس و معذور تھے ان سے کہا جائے گا کہ (یہ ٹھیک ہے کہ تم میں اتنی قوت نہیں تھی کہ تم وہاں باطل کا نظام بدل کر' نظام خداوندی قائم کر لیتے لیکن) خدا کی زمین اس قدر وسیع تھی کیا تم ہجرت کر کے کسی ایسے مقام کی طرف نہیں جا سکتے تھے جہاں نظام خداوندی قائم تھا یا جہاں کی فضا اس کے لئے سازگار تھی؟ یہ جو لوگ یوں اپنی کمزوری اور ناتوانی کا سہارا لے کر غیر خداوندی نظام کے تابع' قانع اور مطمئن ہو کر بیٹھے رہے' ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہاں بھی جہنم کے لئے طاغوتی نظام کی غلامی میں رہے اور وہاں بھی جہنم میں۔ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہی نہیں ہوئی۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنیوالے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ نیز دوسری

جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وکذالک جعلنا فی کل قریۃ اکبر مجرمیھا لیمکروا فیھا وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون (۶/۱۲۳)۔

اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے قصورداروں کو سردار بنایا تا کہ اس میں مکاری کیا کریں اور وہ لوگ جو کچھ بھی مکاری کرتے ہیں اپنے حق میں برا کرتے ہیں اور سمجھتے تک نہیں۔

قرآن کریم غیر خداوندی' طاغوت پر مبنی نظام کے عمائدین و لیڈروں کو ''اکابر مجرمین'' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس آیہ کریمہ کی رو سے مجرم تو اس نظام کے تمام افراد ہوتے ہیں لیکن ان میں اکابر مجرمین اربابِ اقتدار ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم طاغوتی نظام کے لیڈروں اورعوام دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے وہ عوام کو بری الذمہ نہیں ٹھہراتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اندھوں کی طرح دوسروں کے پیچھے چلو۔ تم پر لازم تھا کہ تم اپنی سوچ اور سمجھ سے کام لیتے اور تباہی و بربادی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی تم نے ہی ان کو لیڈر بنایا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ اور تم دونوں جہنم کے عذاب کے مستحق ہو۔ مختلف مقامات پر تمثیلی انداز میں قرآن کریم نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ طاغوت میں رہنے والے عوام اور لیڈر' مذہبی پیشوا اور اربابِ اقتدار سب جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اور آئندہ بھی جہنم ہی ان کا مقام ہوگا۔

یہاں مضمون کے اختصار کے پیش نظر صرف دو آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ اب چند ارشادات نبوی' اسلامی حکومت' امام کی اہمیت اور اطاعت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع الامام فقد اطاعنی۔ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی الامام فقد عصانی۔

(بخاری۔ کتاب الاحکام)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی' اس نے میری نافرمانی کی۔

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ من

فارق من الجماعة .... الخ۔

ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو نظام جماعت سے بالشت بھر بھی ہٹا' اس نے درحقیقت اپنی گردن سے اسلام کا حلقہ اطاعت نکال پھینکا۔

من مات ولیس فی عنقہٖ بیعة مات میتة الجاھلیہ۔

(مسلم۔ باب الامر بلزوم الجماعۃ)

جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا قلاوہ نہیں ہے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

صلو اخمسکم وصوموا شھر کم وادوا زکوة اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنة ربکم۔

پانچ وقت نماز ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو' اپنے مالوں کی زکوٰۃ دیتے رہو اور اپنے صاحبِ امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہوں گے۔

مضمون ہٰذا میں آیاتِ قرآنی اور ارشادات نبوی سے یہ بات ثابت کی جارہی ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کے لئے قرآن کریم کو بحیثیت ایک نظام' ایک ضابطۂ حیات کے متمکن کرنا لازمی وضروری ہے۔ اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور اس نظام کا سربراہ' ایک زندہ اتھارٹی کی شکل میں موجود ہوتا ہے جس کے احکامات پہلے سنے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف روایتی نظریہ یہ چلا آرہا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت قرآن اور روایات کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس کے لئے کسی حکومت' کسی مرکزی اتھارٹی' کسی زندہ سربراہ' کسی شخصیت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کتابوں کے ذریعے اطاعت کی جاسکتی ہے۔ یہ دو مختلف نظریات ہیں جس میں پہلا نظریہ یہ دین کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ دوسرا نظریہ مذہب کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن اس وقت حالات کے تقاضوں' اور وقت کے تھپیڑوں سے مجبور ہو کر مسلمان قرآن کو بحیثیت نظام اور دین کے متمکن تو کرنا چاہتے ہیں لیکن پھر اسی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ مذہب کو بحیثیت دین کے جاری کرنا چاہتے ہیں اور دین یا قرآن کے ضابطۂ حیات میں بھی اطاعت کا مرجع بجائے حکومت اسلامی کے قرآن و حدیث کو ہی اطاعت کا مرجع قرار دے رہے ہیں لیکن اس میں خود تناقض و تضاد ہے۔ غیر اسلامی حکومتوں' جیسے ہندوستان' برطانیہ' فرانس وغیرہ ممالک میں بھی آپ قرآن و سنت کے ذریعے اطاعت

خداوندی کر سکتے ہیں۔ وہاں قرآن وسنت پر عمل کرنے پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس لئے اب جو بھی اسلامی تحریک دین خداوندی برپا کرنے کے لئے کھڑی ہو۔ اس کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ اطاعت کا مرجع حکومتِ اسلامی کو ہی قرار دیں، تب ہی قرآنی حکومت قائم ہوسکتی ہے۔ ورنہ انفرادی طور پر قرآن و حدیث کی اطاعت کرنے سے قرآنی نظام کبھی قائم نہیں ہوگا اور نہ ہی مسلمان اس موجودہ ذلت وخواری سے نکل سکیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کا تو عروج وزوال ہی ان کے دین سے وابستہ ہے۔ اگر دین کو استحکام وعروج حاصل ہے تو مسلمان بھی صاحبِ اقتدار ہوں گے اور اگر ان کا دین ہی کمزور ہو اور عملاً موجود نہ ہو، تو پھر بھلا مسلمان کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ دین کا استحکام ہی مسلمانوں کو مستحکم کرتا ہے اور اسے یہ مقام عنایت کرتا ہے کہ

مومنِ بالائے بر بالا ترے
غیرتِ او سر نتابد ہم سَرے

اقبالؒ

مفہوم: انتم الاعلون کے مصداق، مومن ہر بالا سے بھی بالاتر ہوتا ہے مغلوب ہو کر رہنا تو ایک طرف اس کی غیرت تو کسی کی ہم سری بھی گوارا نہیں کرتی۔

وآخر دعوٰھم ان الحمد لله رب العٰلمین (۱۰/۱۰)